چالیس جواہر پارے

الناشر

نظارت نشرو اشاعت قادیان

چالیس جواہر پارے

﴿ تصنیف لطیف ﴾

حضرت مرزا بشیر احمد رضی اللہ عنہ

ناشر

نظارت نشر و اشاعت صدر انجمن احمدیہ قادیان

نام کتاب	:	چالیس جواہر پارے
مرتبہ	:	حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ایم اے ؓ

اس سے پہلے اس کتاب کے 7 ایڈیشنز انڈیا میں شائع ہو چکے ہیں۔

حالیہ طباعت	:	جون 2015ء
تعداد	:	2000
ناشر	:	نظارت نشر و اشاعت صدر انجمن احمدیہ قادیان ، ضلع گورداسپور، پنجاب، انڈیا-143516
مطبع	:	فضل عمر پرنٹنگ پریس قادیان

ISBN : 978-81-7912-006-6

Chalees Jawahar Parey

Compiled By

Hadhrat Mirza Bashir Ahmad M.A (ra)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (فداہ نفسی) کے ذریعہ عین ضلالت کے وقت دینِ متین اسلام کو دنیا میں قائم کیا اور شریعت اسلام قرآن مجید کو کامل ہدایت کے طور پر نازل کیا اور رسول اکرمؐ جو انسانِ کامل ہیں کو رہتی دنیا تک انسان کے لئے اسوہ قرار دیا۔ کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور احادیث نبویہؐ اسلامی تعلیمات کے ماخذ ہیں۔ دین اسلام کے ان مصادر کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے خود انتظام کیا ہے۔ چنانچہ احادیث نبویؐ کی حفاظت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اہم کردار ادا فرمایا ہے۔ نبی اکرمؐ کی مطہر زندگی کے ہر لمحہ کو محفوظ کرنے کی خاطر یہ مقدس وجود آپؐ کے در پر اصحاب صفہ بن کر پڑے رہے اور آپؐ کے پاک کلام کو سینوں میں راسخ کیا اور نسلاً بعد نسلِ حضورؐ کے افعال مبارکہ واقوال کریمہ کو منتقل کیا اور مرور زمانہ کے ساتھ آئندہ نسلوں نے بڑی محنت سے ان کو کتابی شکل میں بھی محفوظ کیا۔ جوامع الکلام حضرت اقدس محمد مصطفیٰؐ کے اقوال کے تعلق سے اللہ تعالیٰ نے یہ شہادت دی ہے کہ:

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ○ إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡیٌ یُوحٰی (النجم 4-5)

یعنی اور وہ خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتا یہ تو محض ایک وحی ہے جو اتاری جا رہی ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہمارے آقا و مطاع حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وفد عبد القیس کو اسلام کے بنیادی عقائد سے متعارف کرنے کے بعد فرمایا:

احۡفَظُوۡهُ وَأَخۡبِرُوۡهُ مَنۡ وَرَاءَ كُمۡ (صحیح البخاري کتاب العلم)

یعنی ان باتوں کو یاد کر لو اور جنہیں پیچھے چھوڑ آئے ہو انہیں بھی بتاؤ۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر فرمایا:

من حفظ علی أمتی أربعین حدیثا من أمر دینها بعث الله فقیها و کنت له یوم القیامة شافعا وشهیدا (کنز العمال)

یعنی جو شخص میری امت کی اصلاح اور بہبودی کی غرض سے میری (کم از کم) چالیس حدیثیں محفوظ کر لے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ایک عالم دین اور فقیہہ کی صورت میں کھڑا کرے گا اور میں اس کے لئے خدا کے حضور شفاعت کرنے والا اور اس کے ایمان کا گواہ ہوں گا۔

قمر الانبیاء حضرت مرزا بشیر احمد صاحب MA رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احباب جماعت کی سہولت کے لئے علم حدیث کے بنیادی اصول کو بیان کرتے ہوئے احادیث کی مختلف کتب سے چالیس حدیثوں کا انتخاب کر کے ان کا ترجمہ اور ان کی مختصر و جامع تفسیر کتابی شکل میں ترتیب دی ہے تا کہ احباب جماعت حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بابرکت ارشاد کی روشنی میں ان احادیث کو لغوی اور معنوی طور پر یاد کریں اور دوسروں کو بھی سکھائیں تا کہ قیامت کے روز نبی اکرمؐ کی شفاعت کے مستحق ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب MA رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اجر عظیم سے نوازے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ علّیین کے مقام پر فائز کرے۔ آمین

موجودہ دور کے مایۂ ناز عاشق رسولؐ حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز امام جماعت احمدیہ عالمگیر کی اجازت و منظوری سے نظارت نشر و اشاعت قادیان اس کتاب کو شائع کر رہی ہے۔ الحمد للہ علی ذالک

اللہ تعالیٰ اس کتاب کی اشاعت کو ہر لحاظ سے بابرکت بنائے۔ آمین۔ گو ان احادیث کے الفاظ سادہ و مختصر ہیں لیکن ہماری اصلاح و ترقی کے رستے اس میں مخفی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ نفسی) کے ان پاک کلمات کو پڑھنے والوں کے دلوں کو نور سے بھر دے اور ان کے دماغوں کو جلا بخشے اور ان احادیث کو یاد رکھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ارحم الراحمین۔

خاکسار

حافظ مخدوم شریف

ناظر نشر و اشاعت قادیان

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلی عبدہ المسیح الموعود

عرضِ حال

میں نہیں جانتا کہ اس کی وجہ کیا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مجھے بچپن سے حدیث کے علم کے ساتھ ایک قسم کا فطری لگاؤ رہا ہے اور جب کبھی بھی میں کوئی حدیث پڑھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شامل ہو کر حضور کے مقدس کلام سے مشرف ہو رہا ہوں۔ میرا تخیّل مجھے آج سے چودہ سو سال قبل مکّہ مکرمہ کی مسجد حرام اور مدینہ طیبہ کی مسجد نبوی اور حرمین شریفین کی گلیوں اور عرب کے صحرائی راستوں میں پہنچا کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی صحبت اور معنوی رفاقت کا لُطف عطا کر دیتا ہے اور پھر میں کچھ وقت کے لئے دنیا سے کھویا جا کر اس فضا میں سانس لینے لگتا ہوں جس میں ہمارے محبوب آقا نے اپنی خداداد نبوت کے تیئیس ۲۳ مبارک سال گزارے۔

لیکن غالباً جس حدیث نے میرے دل اور دماغ پر سب سے زیادہ گہرا اور سب سے زیادہ وسیع اثر پیدا کیا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے ارشاد سے تعلق رکھتی ہے جس میں فقہ اور علم کلام کا تو کوئی عنصر شامل نہیں مگر میرے ذوق میں وہ اسلام اور روحانیت کی جان ہے۔ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ ایک غریب مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے ماتھے پر عبادت اور

ریاضت کا تو کوئی نشان نہیں تھا مگر اس کے دل میں محبت رسول کی ایک چنگاری تھی جس نے اس کے سینہ میں ایک مقدس چراغ روشن کر رکھا تھا۔اُس نے قربِ رسالت کی دائمی تڑپ کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔''یارسول اللہ قیامت کب آئے گی''؟ آپ نے فرمایا تم قیامت کا پوچھتے ہو کیا اس کے لئے تم نے کوئی تیاری بھی کی ہے؟اس نے دھڑکتے ہوئے دل اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے عرض کیا۔''میرے آقا! نماز روزے کی تو کوئی خاص تیاری نہیں لیکن میرے دل میں خدا اور اس کے رسول کی سچی محبت ہے'' آپ نے اسے شفقت کی نظر سے دیکھا اور فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ یعنی پھر ''تسلی رکھو کہ خدائے وَدُود کسی محبت کرنے والے شخص کو اس کے محبوب سے جدا نہیں کرے گا''۔

یہ حدیث میں نے بچپن کے زمانہ میں پڑھی تھی ۔لیکن آج تک جو میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہوں۔میرے آقا کے یہ مبارک الفاظ قطب ستارے کی طرح میری آنکھوں کے سامنے رہے ہیں اور میں نے ہمیشہ یوں محسوس کیا کہ گویا میں نے ہی رسول خدا سے یہ سوال کیا تھا اور آپ نے مجھے ہی یہ جواب عطا فرمایا اور اس کے بعد میں اس نکتہ کو کبھی نہیں بھولا۔کہ نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ سب برحق ہے۔مگر دل کی روشنی اور روحانیت کی چمک خدا اور رسول کی سچی محبت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔اگر انسان کو یہ نعمت حاصل ہو جائے تو ظاہری عمل زندگی کی روح سے معمور ہو کر اس کے پیچھے پیچھے بھاگا آتا ہے لیکن اگر انسان کو یہ نعمت حاصل نہ ہو تو پھر خشک عمل ایک مردہ لاش سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا جو ظاہر پرست لوگ اپنے سینوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

خدا جانتا ہے کہ اسی محبت رسول کے جذبہ کے ماتحت میں نے یہ رسالہ لکھا ہے تا اگر خدا کو منظور ہو تو اس کے پڑھنے والوں کے دلوں میں اس کی محبت کی چنگاری پیدا ہو جو ہر نیک عمل کی روح اور ہر اعلیٰ خلق کی جان ہے اور وہ اپنے محبوب آقا کے ارشادات کو دلی شوق و ذوق سے سنیں اور اپنے لئے حرز جان بنائیں اور خود میرے واسطے بھی وہ بخشش اور مغفرت اور شفاعتِ رسول کا موجب ہو۔ **آمین یا ارحم الراحمین۔**

خاکسار
مرزا بشیر احمد آف قادیان

تمہید

حدیث کی تعریف

حدیث ایک عربی لفظ ہے۔جس کے بنیادی معنی ایسی نئی بات کے ہیں جو یا تو بالکل ہی نئی ہو یا نئے انداز میں پیش کی گئی ہو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی نئے اور بیش بہا حقائق پر مشتمل ہے۔اس لئے اس کا نام اصطلاحاً حدیث رکھا گیا ہے۔پس حدیث اس مقدس کلام کا نام ہے جو ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ نفسی) کی زبانِ مبارک سے نکلا یا جس میں آپؐ کی پاکیزہ زندگی کا کوئی چشم دید واقعہ بیان کیا گیا۔اور پھر آپؐ کے صحابہؓ اور بعد کے مسلمان راویوں کے ذریعہ وہ کچھ عرصہ کے بعد تحریر میں لاکر محفوظ کرلیا گیا۔عربوں کا حافظہ جیسا کہ عیسائی مؤرخوں تک نے برملا تسلیم کیا ہے غیر معمولی طور پر عمدہ تھا اور جو بات بھی وہ سنتے یا دیکھتے تھے اُسے بڑی حفاظت کے ساتھ یاد رکھتے تھے اور چونکہ حدیث ایک مقدس دینی علم ہے اس لئے اس معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ بڑی احتیاط اور بڑی امانت اور دیانت سے کام لیا گیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو غیر معمولی حفاظت کے ساتھ پیچھے آنے والی نسلوں تک پہنچایا گیا۔بے شک بعض راوی حافظہ اور سمجھ اور دیانت کے لحاظ سے ایسے پکّے نہیں تھے کہ ان کی روایتوں پر پورا اعتماد کیا جا سکے۔مگر حدیث جمع کرنے والے بزرگوں نے ایسے پُختہ اصول مقرر کر دیئے ہیں کہ ان کے ذریعہ مناسب چھان بین کے ساتھ صحیح حدیثوں کو کمزور حدیثوں سے

الگ کیا جا سکتا ہے۔

حدیث بیان کرنے کا طریق:

حدیث بیان کرنے کا طریق عموماً یہ ہوتا تھا کہ جس صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی بات سنی ہوتی تھی یا آپؐ کو کوئی کام کرتے ہوئے دیکھا ہوتا تھا تو اُسے اشاعتِ علم کی غرض سے ایسے لوگوں تک پہنچاتا تھا۔جنہوں نے یہ بات نہیں سنی یا نہیں دیکھی ہوتی تھی یا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک زمانہ نہیں پایا ہوتا تھا اور حدیث بیان کرنے کے الفاظ عموماً اس قسم کے ہوتے تھے کہ میں نے فلاں شخص سے یہ بات سنی ہے کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فلاں صحابی سے سنا کہ اُس نے فلاں موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں ارشاد فرماتے ہوئے سنا یا یہ کام کرتے ہوئے دیکھا کہ ...اور پھر یہ لوگ اسی طریق پر ایمان تازہ کرنے کی غرض سے یا اشاعتِ علم کی غرض سے دوسرے لوگوں تک روایت پہنچاتے چلے جاتے تھے۔اوراس طرح راویوں کے ایک مسلسل اور با قاعدہ سلسلہ کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے محفوظ ہو گئیں۔

راویوں کے طبقات

حدیث کے راوی کئی طبقات میں منقسم ہیں سب سے اوپر کا مسلمان راوی جس نے کوئی بات براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے سنی ہو یا آپؐ کو کوئی کام

کرتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو صحابیؓ کہلاتا ہے اس سے نیچے کا راوی جو صحابی سے سن کر آگے روایت کرتا ہے محدثین کی اصطلاح میں تابعی کہلاتا ہے اور اس سے نیچے کا راوی تبع تابعی کہلاتا ہے اور اس کے بعد عام راویوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حافظہ اور سمجھ اور دیانت کے لحاظ سے بھی راویوں کے مختلف طبقات سمجھے جاتے ہیں۔

حدیث کی مشہور کتابیں

حدیث کی روایتیں عموماً دوسری صدی ہجری کے وسط سے لیکر تیسری صدی ہجری کے آخر تک جمع ہو کر کتابی صورتوں میں مرتب کر لی گئی تھیں۔ حدیث کی کتابیں یوں تو بہت ہیں مگر ان میں سے چھ کتابیں خاص طور پر زیادہ صحیح اور زیادہ مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے ان چھ کتابوں کا نام صحاح ستہ (یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابیں) مشہور ہو گیا ہے۔ ان چھ کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) صحیح بخاری:۔ مرتبہ امام محمد بن اسمٰعیل البخاری (ولادت سنہ ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ) امام بخاری کی یہ کتاب حدیث کی تمام کتابوں میں سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے اور امام بخاری کا ذاتی مقام بھی مسلمہ طور پر سب محدثین میں بالا سمجھا گیا ہے۔ اسی لئے صحیح بخاری کا نام اصح الکتب بعد کتاب اللہ (یعنی کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب) مشہور ہو گیا ہے۔

(۲) صحیح مسلم:۔ مرتبہ امام مسلم بن الحجاج النیشا پوری (ولادت سنہ ۲۰۴ھ وفات ۲۶۱ھ) ان کی کتاب صحاح ستہ میں دوسرے نمبر پر شمار ہوتی ہے اور نہایت عمدہ اور

قابلِ اعتماد مجموعہ سمجھی گئی ہے۔اکثر محدثین صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو ملا کر صحیحین (یعنی حدیث کی دو صحیح ترین کتابیں) کا نام دیتے ہیں۔

(۳) جامع ترمذی:۔ مرتبہ امام ابوعیسٰی محمد بن عیسٰی الترمذی (ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ء) یہ امام بخاری کے شاگرد تھے۔ان کا مجموعہ احادیث بھی نہایت اعلیٰ مقام پر مانا گیا ہے۔

(۴) سنن ابو داؤد:۔ مرتبہ امام ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی (ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ) فقہی مسائل کی تدوین میں انہیں بہت ارفع مقام حاصل ہے۔مگر اس بارے میں محققین میں اختلاف ہے کہ جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد میں سے کس کا مقام زیادہ بلند ہے۔

(۵) سنن النسائی:۔ مرتبہ امام احمد بن شعیب النسائی (ولادت ۲۱۵ھ وفات ۳۰۶ھ) امام نسائی بھی حدیث کے بڑے ائمہ میں سے ہیں۔اور ان کی کتاب کا درجہ صحاح سِتہ میں عموماً پانچویں نمبر پر مانا گیا ہے۔

(۶) سنن ابن ماجه:۔ مرتبہ امام محمد بن یزید ابن ماجہ القزدینی (ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ) یہ کتاب صحاح ستہ میں چھٹے یعنی آخری نمبر پر سمجھی جاتی ہے۔سنن ابن ماجہ بھی حقیقتہً ایک عمدہ کتاب ہے۔

ان جملہ محدثین نے صحیح حدیثوں کی تلاش اور چھان بین میں اپنی عمریں خرچ کر کے لاکھوں حدیثوں کے ذخیرہ میں سے اپنے مجموعوں کا انتخاب تیار کیا ہے۔لاریب تمام عالمِ اسلامی کو ان بزرگوں کا دلی شکرگزار ہونا چاہئے وجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

اوپر کی چھ مشہور کتابوں کے علاوہ حدیث کی مندرجہ ذیل دو کتابیں بھی بہت مشہور ہیں:۔

(۱) **موطّا:**۔مرتبہ امام مالک ابن انس المدنی (ولادت ۹۵ھ وفات ۱۷۹ھ) امام مالک حدیث کے امام ہونے کے علاوہ فقہ کے بھی امام سمجھے جاتے ہیں یعنی وہ فقہ کے ان چار مشہور اماموں میں سے ہیں جنہیں مسلمانوں کا بیشتر حصہ فقہی امور میں قابلِ تقلید خیال کرتا ہے۔امام مالک کی فقہ پر عمل کرنے والے مسلمان مالکی کہلاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین زمانہ میں پیدا ہونے اور پھر خاص شہر مدینہ میں تربیت پانے کی وجہ سے امام مالک کا مقام بھی بہت بلند سمجھا جاتا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی مجدد صدی دوازدہم نے تو ان کی کتاب موطّا کا درجہ اپنے ذوق کے مطابق صحیح بخاری سے بھی بالا قرار دیا ہے۔لیکن اس میں شک نہیں کہ موطّا ایک بہت بلند پایہ کتاب ہے۔

(۲) **مسند احمد:**۔مرتبہ امام احمد بن حنبل البغدادی (ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۲ھ) امام مالک کی طرح امام احمد بن حنبل بھی حدیث اور فقہ ہر دو کے امام سمجھے جاتے ہیں اور ان کی فقہ پر عمل کرنے والے مسلمان حنبلی کہلاتے ہیں امام احمد بن حنبل کے فرزند کی بے احتیاطی کی وجہ سے ان کے مجموعہ میں بعض کمزور حدیثیں بھی راہ پا گئی ہیں ورنہ ان کا اپنا جمع کیا ہوا مجموعہ نہایت شاندار تھا۔

فقہ کے باقی دو امام امام ابوحنیفہ (ولادت ۸۰ ہجری وفات ۱۵۰ھ) اور امام شافعی (ولادت ۱۰۵ھ وفات ۲۰۴ھ) ہیں امام ابوحنیفہ جن کے مقلدین کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔عرف عام میں امام اعظم کہلاتے ہیں۔ اور ان کا درجہ فقہ کے

سارے اماموں میں بلند تر مانا گیا ہے۔امام حنیفہ کی توجہ زیادہ تر فقہ کی تدوین کی طرف رہی۔لیکن امام شافعی کا حدیث کا مجموعہ بھی جو کتاب **الاُمّ** کہلاتا ہے کافی شہرت رکھتا ہے۔

حدیث کی اقسام:

محدثین نے حدیث کی بہت سی قسمیں قرار دی ہیں۔ان میں سے ذیل کی اقسام زیادہ مشہور ہیں:۔

۱۔**حدیث قولی**:۔یعنی وہ حدیث جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ بیان کئے گئے ہوں۔مثلاً کوئی صحابی یہ بیان کرے کہ فلاں موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تقریر فرمائی یا فلاں شخص کے ساتھ یہ گفتگو کی یا فلاں صحابی کو یہ حکم دیا وغیرہ وغیرہ۔

۲۔**حدیث فعلی**:۔یعنی وہ حدیث جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کا ذکر نہ ہو بلکہ صرف فعل کا ذکر ہو مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں موقعہ پر یہ کام کیا۔یا فلاں دینی فریضہ اس اس رنگ میں ادا فرمایا۔وغیرہ وغیرہ۔

۳۔**حدیث تقریری**:۔یعنی وہ حدیث جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل تو بیان نہ کیا گیا ہو لیکن یہ ذکر ہو کہ آپ کے سامنے فلاں شخص نے فلاں کام کیا یا فلاں بات کہی۔اور اسے آپ نے اس کام کے کرنے یا اس بات کے کہنے سے نہیں روکا۔دراصل عربی زبان میں ''تقریر'' کے معنی بولنے کے

نہیں ہوتے بلکہ کسی بات کو برقرار رکھنے کے ہوتے ہیں۔پس حدیث تقریری سے وہ حدیث مراد ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کے فعل یا قول کو صحیح سمجھتے ہوئے اسے برقرار رکھا ہو اور اس پر اعتراض نہ فرمایا ہو۔

۴۔**حدیث قدسی:**۔یعنی وہ حدیث جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف کوئی ارشاد یا فعل منسوب کیا ہو۔مثلاً یہ فرمایا ہو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس اس طرح ارشاد فرمایا ہے اور یہ بات قرآنی وحی کے علاوہ ہو۔

۵۔**حدیث مرفوع:**۔یعنی وہ حدیث جس کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو اور آپؐ کی طرف کوئی بات براہِ راست منسوب کی گئی ہو کہ آپ نے فلاں موقعہ پر یہ بات فرمائی۔

۶۔**حدیث موقوف:**۔یعنی وہ حدیث جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کی بجائے کسی صحابی تک آ کر رک جاتی ہو مگر اس حدیث کی نوعیت اور صحابی کا اندازِ بیان ایسا ہو کہ یہ قیاس کیا جائے کہ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی گئی ہوگی۔

۷۔**حدیث متصل:**۔یعنی وہ حدیث جس کے تمام راوی پوری پوری ترتیب کے ساتھ مذکور ہوں۔اور کوئی راوی درمیان میں چھٹا ہوا نہ ہو۔

۸۔**حدیث منقطع:**۔یعنی وہ حدیث جس کا کوئی راوی درمیان میں سے چھٹا ہوا ہو۔جس کی وجہ سے ایسی حدیث کے حسن و قبح کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۹۔**حدیث صحیح:**۔یعنی وہ حدیث جس کے تمام راوی حافظہ اور سمجھ اور

دیانت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں۔اور اگر غور کیا جائے تو ایک راوی کو قابلِ اعتماد سمجھنے کے لئے یہی تین اوصاف ضروری ہوتے ہیں۔

۱۰۔**حدیث ضعیف:**۔یعنی وہ حدیث جس کا کوئی راوی حافظہ یا سمجھ یا دیانت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد نہ ہو۔حتیٰ کہ اگر کسی حدیث کے راویوں میں سے کوئی ایک راوی بھی نا قابلِ اعتماد ہوگا تو باوجود اس کے کہ دوسرے راوی قابلِ اعتماد ہوں یہ حدیث ضعیف سمجھی جائے گی۔

۱۱۔**حدیث موضوع:**۔یعنی وہ حدیث جس کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ وہ کسی دروغ گو راوی نے اپنی طرف سے وضع کر کے بیان کر دی ہے۔

۱۲۔**اثر:**۔(جس کی جمع آثار ہے)اس روایت کو کہتے ہیں جو صرف کسی صحابی کے قول پر مشتمل ہو اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی بات منسوب نہ کی گئی ہو۔اس سے ظاہر ہے کہ اثر دراصل حدیث کی اقسام میں شامل نہیں ہے۔بلکہ ایک جدا گانہ چیز ہے۔مگر چونکہ حدیث کی کتابوں میں بالعموم آثار بھی شامل ہوتے ہیں اس لئے بعض اوقات عام لوگ ان دونوں اصطلاحوں میں فرق نہیں کرتے۔

حدیث اور سنت میں فرق

ایک ضروری بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ گو عام لوگ حدیث اور سنت میں فرق نہیں کرتے مگر دراصل یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں حدیث تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان افعال یا اقوال کا نام ہے جو راویوں کی زبانی روایت کی بناء پر

سینہ بسینہ نیچے پہنچے اور پھر ایک سو یا ڈیڑھ سو یا دو سو یا اڑھائی سو سال کے بعد لوگوں کے سینوں سے جمع کر کے کتابی صورت میں مرتب کر لئے گئے لیکن اس کے مقابل پر سنت کسی لفظی روایت کا نام نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تعامل کا نام ہے جو آپؐ نے کسی دینی امر میں اختیار فرمایا اور اپنی نگرانی میں اپنے صحابہ کو اس پر قائم فرما دیا اور پھر اسی طرح عملی نمونہ کی صورت میں یہ تعامل بعد میں آنے والے لوگوں تک پہنچا۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز کے متعلق قرآنی احکام نازل ہوتے۔ تو بظاہر ان احکام میں نماز کی پوری پوری تفصیل صراحتہً درج نہیں تھی کہ دن میں کتنی نمازیں فرض ہیں اور ان کا کون کون سا وقت ہے اور ہر نماز میں کتنی رکعات ہونی چاہئیں اور ہر رکعت کس طرح ادا کی جانی ضروری ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس پر آپؐ نے خدا تعالیٰ کی وحی خفی کے ماتحت یا خداداد نور نبوت کی روشنی میں صحابہ کے سامنے ان احکام کا عملی نمونہ پیش کیا اور صحابہ کو اپنی نگرانی میں اس نمونہ پر قائم فرما دیا اور پھر صحابہ نے آگے اپنے نمونہ کا عملی ورثہ تابعین کو دیا۔ اور تابعین نے آگے یہ سبق اپنے عملی نمونہ کے ذریعہ تبع تابعین تک پہنچایا۔ اور اس طرح تعامل کی ایک مسلسل زنجیر قائم ہوتی چلی گئی۔

پس دراصل سنت حدیث سے ایک بالکل علیحدہ اور جداگانہ چیز ہے اور حدیث کی نسبت بہت زیادہ وزن اور پختگی کا پہلو رکھتی ہے اس لئے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اسلامی شریعت کی اصل بنیاد قرآن شریف اور سنت پر ہے۔ کیونکہ قرآن خدا کا کلام ہے اور سنت اس کلام کی تشریح ہے جو خدا کے رسول نے اپنے عملی نمونہ سے قائم فرمائی۔ اور پھر وہ صحابہ کرام کے عملی نمونہ کے ذریعہ بعد والی نسل کو پہنچی اور پھر بعد والی

نسل سے اس سے بعد والی نسل کو پہنچی اور اس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہوتی چلی گئی۔لیکن اس کے مقابل پر حدیث جو قولی روایات کا مجموعہ ہے (حتی کہ اس کی فعلی اور تقریری حدیثیں بھی دراصل قولی روایات کے ذریعہ ہی ہم تک پہنچی ہیں) صرف ایک تائیدی گواہ کا رنگ رکھتی ہے۔ بیشک وہ ایک زبردست تائیدی گواہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔مگر بہر حال اسے وہ بنیادی حیثیت حاصل نہیں جو قرآن اور سنت کو حاصل ہے۔تاہم اس بات میں ذرہ بھر بھی کلام نہیں کہ حدیث ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا تاریخی اور علمی اور روحانی خزانہ ہے اور جب تک کوئی حدیث قرآن شریف کی کسی آیت یا کسی صحیح حدیث کے خلاف نہ ہو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قرآنی حکم اطیعوا الرسول کے ماتحت اسے قبول کر کے اپنی زندگی کے لئے مشعلِ راہ بنائے۔لیکن افسوس ہے کہ آج کل بعض مسلمان کہلانے والے اس بیش بہا علمی خزانہ کی اہمیت کو کم کرنے کے درپے ہیں۔

چالیس حدیثوں کا مجموعہ

اوپر کے تمہیدی نوٹ کے بعد یہ خاکسار ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس منتخب شدہ حدیثوں کے درج کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے یہ حدیثیں حدیث کی مشہور اور مستند کتابوں سے لی گئی ہیں اور ہر حدیث کے نیچے اس کا سلیس اردو ترجمہ لکھ کر مختصر تشریح بھی درج کر دی گئی ہے میں اُمید کرتا ہوں کہ اگر مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ان چالیس حدیثوں کو یاد کر کے اور ان کے معانی کو اپنے ذہنوں میں محفوظ کر کے ان پر عمل کریں اور ان سے فائدہ اٹھائیں تو انشاء اللہ ان کے لئے اور ان کے گھروں کے

لئے برکت اور رحمت اور مغفرت کا موجب ہوگا چالیس کا عدد اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ ایک تو وہ قرآن شریف میں تکمیل کی علامت کے طور پر بیان ہوا ہے اور دوسرے ایک حدیث میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا فِیْ اَمْرِ دِیْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰه تَعَالٰی فَقِیْهًا وَ کُنْتُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ شَافِعًا وَّ شَهِیْدًا۔ (بیهقی)

''یعنی جو شخص میری امت کی اصلاح اور بہبودی کی غرض سے میری (کم از کم) چالیس حدیثیں محفوظ کر لے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ایک عالمِ دین اور فقیہہ کی صورت میں کھڑا کرے گا اور میں اس کے لئے خدا کے حضور شفاعت کرنے والا اور اس کے ایمان کا گواہ ہوں گا''۔

اس تمہیدی نوٹ کے بعد میں اپنی انتخاب کردہ چالیس حدیثیں درج ذیل کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ اسے میرے لئے اور اس مجموعہ کے پڑھنے والوں کے لئے فضل اور رحمت اور برکت اور مغفرت کا موجب بنائے۔ آمین یا ارحم الراحمین۔

﴿ 1 ﴾

چھ شرائطِ ایمان

عَنۡ عُمَرَبۡنِ الۡخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اَلۡاِیۡمَانُ اَنۡ تُؤۡمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَتُؤۡمِنَ بَالۡقَدۡرِ خَیۡرِہٖ وَشَرِّہٖ (مسلم)

ترجمہ: ۔حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور یوم آخر یعنی جزا سزا کے دن پر ایمان لائے اور اس کے علاوہ تو خدا کی تقدیر خیر وشر پر بھی ایمان لائے‘‘۔

تشریح: ۔اس حدیث میں اسلام کی تعلیم کے مطابق ایمان کی تشریح بیان کی گئی ہے جو چھ بنیادی باتوں پر مشتمل ہے۔

(اوّل) اللہ پر ایمان لانا جو دنیا کا واحد خالق و مالک خدا ہونے کی وجہ سے ایمانیات کا مرکزی نقطہ ہے۔اور یاد رکھنا چاہئے کہ عربی زبان میں اللہ کا لفظ خدائے واحد کے سوا کسی اور کے متعلق استعمال نہیں کیا جاتا اور اس سے مراد ایسی ہستی ہے جو تمام عیوب سے پاک اور تمام صفاتِ حسنہ سے متصف اور تمام علوم کی حامل اور تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔

(دوم) فرشتوں پر ایمان لانا جو خدا کی ایک نہ نظر آنے والی مگر نہایت اہم

مخلوق ہے۔فرشتے خدا کے حکم کے ماتحت اس کارخانۂ عالم کو چلانے والے اور خدا کی طرف سے پیدا کئے ہوئے اسباب کے نگران ہیں۔ اور فرشتے خدا اوراس کے رسولوں کے درمیان پیغام رسانی کا واسطہ بھی بنتے ہیں۔

(سوم) خدا کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان لانا جن کے ذریعہ دنیا کو خدا تعالیٰ کے منشاء کا علم حاصل ہوتا ہے۔ان کتابوں میں سے آخری اور دائمی کتاب قرآن شریف ہے۔جس نے پہلی تمام شریعتوں کو جو وقتی اورقومی نوعیت کی تھیں منسوخ کردیا ہے اوراب قیامت تک قرآن کے سوا کوئی اور شریعت نہیں۔

(چہارم) خدا کے رسولوں پر ایمان لانا۔جن پر وقتاً فوقتاً الہامی کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں اور جو اپنے عملی نمونہ سے خدا کے منشاء کو دنیا پر ظاہر کرتے رہے ہیں۔ان میں سے آخری صاحبِ شریعت نبی اور خاتم النبیین ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔جو سید ولد آدم اور فخرِ انبیاء اور افضل الرسل ہیں۔

(پنجم) یومِ آخر پر ایمان لانا جو موت کے بعد آنے والا ہے اور جس میں انسان نئی زندگی حاصل کرکے اپنے ان اچھے یا برے اعمال کا بدلہ پائے گا جو اس نے دنیا میں کئے ہوں گے۔

(ششم) تقدیر خیر و شر پر ایمان لانا جو خدا کی طرف سے دنیا میں جاری شدہ قانون کی صورت میں قائم ہے۔یعنی اس بات پر یقین رکھنا کہ دنیا کا قانون قدرت اور قانونِ شریعت ہر دو خدا کے بنائے ہوئے قانون ہیں۔اور خدا ہی اس سارے مادی اور روحانی نظام کا بانی اور نگران ہے خدا نے ہر کام کے متعلق خواہ وہ روحانی ہے یا مادی یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ اگر یوں کرو گے تو اس کا اس اس طرح اچھا نتیجہ نکلے

گا۔ اور اگر یوں کرو گے تو اس کا اس اس طرح خراب نتیجہ نکلے گا اور پھر خدا اپنے قانون کا مالک بھی ہے اور ایسے امور میں جو اس کی کسی بیان کردہ سنت یا وعدہ یا صفت اور پھر خدا کے خلاف نہ ہوں۔ وہ اس قانون میں اپنے رسولوں اور نیک بندوں کی خاطر خاص حالات میں استثنائی طور پر تبدیلی بھی کرسکتا ہے چنانچہ معجزات کا سلسلہ عموماً اسی استثنائی قانون سے تعلق رکھتا ہے۔

﴿ 2 ﴾

پانچ ارکانِ اسلام

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَ حَجُّ الْبَيْتِ وَ صَوْمُ رَمَضَانَ (بخاری)

ترجمہ:۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے (۱) اس بات کی دل اور زبان سے گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی قابل پرستش نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوۃ ادا کرنا (۴) بیت اللہ کا حج بجالانا اور (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔

تشریح:۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں اوپر والی حدیث (یعنی پہلی حدیث) میں ایمان کی تشریح بیان کی گئی تھی۔ وہاں موجودہ حدیث میں اسلام کی تشریح بیان کی گئی ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایمان عقیدہ کا نام ہے اور اسلام عمل کا نام ہے اور دین کی تکمیل کے لئے یہ دونوں باتیں نہایت ضروری ہیں اور یہ جو ان دونوں حدیثوں میں خدا اور رسول پر ایمان لانے کو مشترک رکھا گیا ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ پہلی حدیث میں تو ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کو صرف دل کے عقیدہ اور زبان کی تصدیق کے اظہار کے لئے شامل کیا گیا ہے مگر دوسری حدیث میں وہ عمل کی بنیاد

بننے کی حیثیت میں داخل کیا گیا ہے بہر حال موجودہ حدیث کی رُو سے اسلام کی تعریف میں سب سے اوّل نمبر پر یہ بات رکھی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لایا جائے تا کہ ایک مسلمان کا ہر عمل اسی مقدس عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہو کہ خدا ایک ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف سے آخری شریعت لانے والے نبی ہیں اس کے بعد چار عملی عبادتیں گنائی گئی ہیں جو یہ ہیں:۔

(ا) پہلی عبادت صلوٰۃ یعنی نماز ہے جس کے معنی عربی زبان میں دعا اور تسبیح و تحمید کے ہیں۔نماز دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازوں کی صورت میں فرض کی گئی ہے اور جسمانی طہارت یعنی مسنون وضو کے بعد مقررہ طریق پر ادا کی جاتی ہے۔ان پانچ نمازوں میں سے ایک صبح کی نماز ہے جو صبح صادق کے بعد اور سورج نکلنے سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔دوسرے ظہر کی نماز ہے جو سورج کے ڈھلنے یعنی دوپہر کے بعد پڑھی جاتی ہے۔تیسرے عصر کی نماز ہے جو سورج کے کافی نیچا ہو جانے کے وقت پڑھی جاتی ہے۔چوتھے مغرب کی نماز ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد پڑھی جاتی ہے اور پانچویں عشاء کی نماز ہے جو شفق کے غائب ہونے کے بعد پڑھی جاتی ہے اس طرح نہ صرف دن کے مختلف اوقات کو بلکہ رات کے ہر دو کناروں کو بھی خدا کے ذکر اور خدا کی عبادت اور خدا سے اپنی دعاؤں کے طلب میں خرچ کیا جاتا ہے۔نماز کی غرض وغایت خدا تعالیٰ سے ذاتی تعلق پیدا کرنا اور اس کی یاد کو اپنے دل میں تازہ رکھنا۔اور اس کے ذریعہ اپنے نفس کو فحشاء اور منکرات سے پاک کرنا اور خدا سے اپنی حاجتیں طلب کرنا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

ایک ارشاد کے مطابق کامل نماز وہ ہے جس میں نماز پڑھنے والا اس وجدان سے معمور ہو کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ یا کم از کم یہ کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔نماز کے اوقات میں انسانی زندگی کے مختلف حصوں کی طرف لطیف اشارہ رکھا گیا ہے اور اسی لئے دن کے آخری حصہ میں جب رات کی تاریکی قریب آرہی ہوتی ہے نمازوں کے درمیانی وقفہ کو کم کر دیا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ کیا جائے کہ عالمِ آخرت کی تیاری عمر کی زیادتی کے ساتھ تیز تر ہوتی چلی جانی چاہئے۔نماز کی عبادت حقیقتہً روحانیت کی جان ہے اور اسی لئے اسے مومن کا معراج قرار دیا گیا ہے اور نماز کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی شغف اور ذاتی سرور کا یہ عالم تھا کہ آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے ''**جُعِلَتْ قُرَّةُعَيْنِىْ فِى الصَّلٰوةِ**''۔یعنی نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

(۲) دوسری عملی عبادت اسلام میں زکوٰۃ ہے جس کے معنی کسی چیز کو پاک کرنے اور بڑھانے کے ہیں۔زکوٰۃ کی بڑی غرض یہ ہے کہ ایک طرف امیروں کے مال میں سے غریبوں کا حق نکال کر اسے پاک کیا جائے اور دوسری طرف غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی امداد کا سامان مہیا کر کے قوم کے مقام کو بلند کیا جائے اور اس کے افراد کو اوپر اٹھایا جائے۔زکوٰۃ کا ٹیکس مال کا ضروری اور اصل حصہ چھوڑ کر زائد مال پر جسے شرعی اصطلاح میں نصاب کہتے ہیں لگایا جاتا ہے۔یہ ٹیکس چاندی سونے اور چاندی سونے کے زیورات اور چاندی سونے کے سکوں (جن میں کرنسی نوٹ بھی شامل ہیں) اڑھائی فیصدی سالانہ کے حساب سے مقرر ہے۔مگر یاد رکھنا چاہئے کہ سونے کا علیحدہ نصاب مقرر نہیں ہے۔ بلکہ چاندی کے نصاب کی قیمت کی بنیاد پر ہی

سونے کے نصاب کا فیصلہ کیا جائے گا۔ جولازماً ان دو دھاتوں کی نسبتی قیمت کے لحاظ سے بڑھتا گھٹتا رہے گا۔ تجارتی مال پر بھی اڑھائی فیصدی سالانہ کی شرح مقرر کی گئی ہے۔ زرعی زمینوں اور باغات کی فصل پر بارانی فصل کی صورت میں دسواں حصہ اور مصنوعی آبپاشی کی صورت میں بیسواں حصہ زکوٰۃ مقرر ہے بھیڑ بکریوں کی صورت میں قطع نظر تفصیلات کے ہر چالیس بکریوں سے لے کر ایک سو بیس بکریوں تک پر ایک بکری اور گائے بھینسوں کی صورت میں تیس جانوروں پر ایک بچھڑا اور اونٹوں کی صورت میں ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری اور پچیس اونٹوں پر ایک جوان اونٹنی مقرر ہے اور زمین کی کانوں اور دفینوں اور بند خزانوں پر بیس فیصدی یک مشت کی شرح سے زکوٰۃ لگتی ہے اور پھر زکوٰۃ کی یہ سب آمدنی فقراء اور مساکین کے علاوہ مقروضوں اور مسافروں اور غلاموں اور مؤلفتہ القلوب لوگوں اور دینی مہموں میں حصہ لینے والوں اور زکوٰۃ کا انتظام کرنے والے عملہ پر خرچ کی جاتی ہے۔ اس طرح زکوٰۃ قومی دولت کو سمونے کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے۔

(۳) تیسری عملی عبادت حج ہے۔ حج کے معنی کسی مقدس مقام کی طرف سفر اختیار کرنے کے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد مکہ مکرمہ میں جا کر خانہ کعبہ اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں کا طواف کرنا اور پھر مکہ سے نو میل پر عرفات کے تاریخی میدان میں وقوف کر کے دعائیں کرنا اور پھر واپسی پر مزدلفہ میں قیام کر کے عبادت بجالانا اور بالآخر مکہ سے تین میل پر منیٰ کے مقام میں قربانی دینا ہے۔ حج جو ماہ ذوالحجہ کی آٹھویں اور نوویں اور دسویں تاریخوں میں ہوتا ہے صرف ایک مقدس ترین جگہ کی زیارت ہی نہیں جس کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی

قربانی اور پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی قربانی کی مقدس روایات وابستہ ہیں بلکہ حج مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کے مسلمانوں کو آپس میں ملنے اور تعارف پیدا کرنے اور ایک دوسرے سے ملی معاملات میں مشورہ کرنے کا بے نظیر موقعہ بھی مہیا کرتا ہے۔ حج ساری عمر میں صرف ایک دفعہ بجالانا فرض ہے اور جیسا کہ دوسری حدیث میں صراحت آئی ہے اس کے لئے صحت اور واجبی خرچ اور راستہ میں امن کا ہونا ضروری شرط ہے۔

(۴) چوتھی عملی عبادت رمضان کے روزے ہیں یہ روزے ہر ایسے مسلمان پر جو بلوغ کی عمر کو پہنچ چکا ہو اور بیمار یا مسافر نہ ہو فرض کئے گئے ہیں۔ بیمار یا مسافر کو دوسرے ایام میں گنتی پوری کرنی پڑتی ہے روزہ کے لئے عربی میں صوم کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی اپنے نفس کو روکنے کے ہیں۔ یہ عبادت رمضان کے مہینہ میں جو قمری حساب کے مطابق سال کے مختلف موسموں میں چکر لگاتا ہے۔ ادا کی جاتی ہے۔ اور صبح صادق سے قبل سحری کا کھانا کھا کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور بیوی کے ساتھ اختلاط کرنے سے پرہیز کیا جاتا ہے گویا روزوں میں مسلمانوں کی طرف سے زبان حال سے اپنی ذات اور اپنی نسل کی قربانی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے روزے نفس کو پاک کرنے اور مشقت کا عادی بنانے کے علاوہ غریبوں کی غربت کا احساس پیدا کرانے اور مومنوں میں قربانی کی روح کو ترقی دینے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ حقیقتہً روزہ ایک بہت ہی بابرکت عبادت ہے۔

﴿ 3 ﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ خصوصیات

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَّمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَّجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا ....وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَ اُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّ بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً۔ (بخاری)

ترجمہ: جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مجھے خدا کی طرف سے پانچ ایسی باتیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو عطا نہیں ہوئیں اوّل مجھے ایک مہینے کی مسافت کے اندازے کے مطابق خداداد رعب عطا کیا گیا ہے ۔دوسرے میرے لئے ساری زمین مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنا دی گئی ہے تیسرے میرے لئے جنگوں میں حاصل شدہ مال غنیمت جائز قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ مجھ سے پہلے وہ کسی کے لئے جائز نہیں تھا۔چوتھے مجھے خدا کے حضور شفاعت کا مقام عطا کیا گیا ہے اور پانچویں مجھ سے پہلے ہر نبی صرف اپنی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا۔لیکن میں ساری دنیا اور سب قوموں کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔

تشریح: اس حدیث میں ہمارے آقا (فداہ نفسی) کی پانچ ممتاز خصوصیات

بیان کی گئی ہیں جن سے آپ کی ارفع شان اور آپ پر خدا تعالیٰ کی غیر معمولی شفقت کا ثبوت ملتا ہے۔

پہلی خصوصیت:

آپ کی یہ ہے کہ آپ کو ایک مہینہ کی مسافت کے اندازے کے مطابق خداداد رعب عطا کیا گیا۔ چنانچہ تاریخِ اسلام اس بات کی زبردست شہادت پیش کرتی ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بظاہر کمزوری اور فقر کی حالت کے باوجود ہر دشمن آپ کے خداداد رعب سے کانپتا تھا۔ حتّٰی کہ بسا اوقات ایسا ہوا کہ دشمن نے مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک قلیل جماعت لے کر اس کے مقابلے کے واسطے نکلے تو وہ آپ کی آمد کی خبر سنتے ہی بھاگ گیا۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانہ کے سب سے بڑے بادشاہ قیصر روم کو ایک تبلیغی خط لکھا تو اس نے آپؐ کے حالات سن کر کہا کہ اگر میں اس نبی کے پاس پہنچ سکوں تو آپؐ کے پاؤں دھونے میں اپنی سعادت سمجھوں۔

دوسری خصوصیت:

آپ کی یہ ہے کہ آپؐ کے لئے ساری زمین مسجد بنا دی گئی جس کے نتیجہ میں ایک مسلمان جہاں بھی اُسے نماز کا وقت آجائے اپنی نماز ادا کر سکتا ہے اور دوسری قوموں کی طرح اسے کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے یہ اس لئے ضروری تھا تا کہ مسلمانوں کے وسیع مجاہدانہ پروگرام میں سہولت پیدا کی جائے اسی

طرح آپ کے لئے زمین طہارت کا ذریعہ بھی بنادی گئی جس کا ادنیٰ پہلو یہ ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو ایک مسلمان وضو کی جگہ پاک مٹی کے ساتھ تیمّم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے اور یہ پانی اور مٹی کا جوڑ حضرت آدم کی خِلقت کے پیش نظر رکھا گیا ہے جنہیں قرآنی محاورہ کے مطابق گیلی مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔

تیسری خصوصیت:

آپ کی یہ ہے کہ بخلاف سابقہ شریعتوں کے جن میں غنیمت کے مال کو جلا دینے کا حکم تھا۔آپ کے واسطے جنگوں میں ہاتھ آنے والا مالِ غنیمت حلال کیا گیا ہے۔جس میں یہ حکمت ہے کہ ایک تو قوموں کے اموال یونہی ضائع نہ ہوں اور دوسرے ظالم لوگوں کو یہ سبق دیا جائے کہ اگر تم دوسروں پر دست درازی کرو گے تو تمہارے اموال تم سے چھین کر مظلوموں کے ہاتھ میں دے دئے جائیں گے اور تیسرے یہ کہ اسلامی غزوات میں کمزور مسلمانوں کے لئے مضبوطی کا سامان پیدا کیا جائے۔

چوتھی خصوصیت:

آپ کی یہ ہے کہ آپ کو شفاعت کا ارفع مقام عطا کیا گیا ہے۔شفاعت کے لفظی معنی جوڑ کے ہیں اور اصطلاحی طور پر اس سے مراد عام دعا نہیں ہے بلکہ وہ مخصوص مقام مراد ہے جس میں ایک مقرب انسان اپنے دوہرے تعلق کی بناء پر (یعنی ایک طرف خدا کا تعلق اور دوسری طرف بندوں کا تعلق) خدا کے حضور سفارش کرنے کا حق

حاصل کرتا ہے اور اس سفارش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے خدا! میں ایک طرف تیرے ساتھ اپنے خاص تعلق کا واسطہ دے کر اور دوسری طرف تیری مخلوق کے لئے (یا فلاں مخصوص فرد کے لئے) اپنے قلبی درد کو تیرے سامنے پیش کر کے تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ اپنے ان کمزور بندوں پر رحم فرما اور انہیں بخش دے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے دن لوگوں میں انتہائی گھبراہٹ اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگی تو اس وقت وہ تمام دوسری طرفوں سے مایوس ہو کر میرے پاس آئیں گے اور پھر میں خدا کے حضور ان کی شفاعت کروں گا۔ اور میری شفاعت قبول کی جائے گی۔

پانچویں خصوصیت

آپ کی یہ ہے کہ جہاں گزشتہ نبی صرف خاص خاص قوموں کی طرف اور خاص خاص زمانوں کے لئے آئے تھے وہاں آپ ساری قوموں اور سارے زمانوں کے واسطے مبعوث کئے گئے ہیں۔ یہ ایک بڑی خصوصیت اور بہت بڑا امتیاز ہے جس کے نتیجہ میں آپ کا خداداد مشن ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے وسیع ہو گیا اور آپ خدا کے کامل اور مکمل مظہر قرار دئے گئے ہیں یعنی جس طرح ساری دنیا کا خدا ایک ہے۔ اسی طرح آپ کی بعثت سے ساری دنیا کا نبی بھی ایک ہو گیا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ۔

﴿ 4 ﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری شریعت لانے والے نبی ہیں

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اٰخِرُ الْاَنْبِیَآءِ وَ اِنَّ مَسْجِدِیْ ھٰذَا اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ (مسلم)

ترجمہ:۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں آخری نبی ہوں اور میری یہ (مدینہ کی) مسجد آخری مسجد ہے۔

تشریح: اس لطیف حدیث میں ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں آخری نبی ہوں اور میرے بعد کوئی ایسا مصلح نہیں آ سکتا جو میری نبوت کے دور کو منسوخ کر کے اور میرے مقابل پر کھڑا ہو کر ایک نیا دور شروع کر دے بلکہ اگر کوئی آئے گا تو وہ لازماً میرا تابع اور میرا شاگرد اور میری شریعت کا خادم ہونے کی وجہ سے میری نبوت کے دور کے اندر ہوگا نہ کہ اس سے باہر۔ اس لطیف مضمون کو واضح فرمانے کے لئے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ زیادہ فرمائے ہیں کہ **مسجدی ھذا أخر المساجد** ''یعنی میری یہ (مدینہ والی) مسجد آخری مسجد ہے'' اب ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ ہی واقعات اس کی تائید کرتے ہیں کہ آیندہ دنیا میں کوئی اور مسجد بنے گی ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آئندہ کوئی مسجد میری مسجد کے مقابل پر نہیں بنے گی بلکہ جو

مسجد بھی بنے گی وہ میری اس مسجد کے تابع اور اس کی نقل اور ظل ہوگی۔

اسی طرح انی اٰخر الانبیآء (میں آخری نبی ہوں) کے بھی یہی معنی ہیں کہ آئندہ کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو میری غلامی سے آزاد ہو کر میری نبوت کے مقابل پر کھڑا ہو اور میرے دین کو چھوڑ کر کوئی نیا دین لائے بلکہ اگر کوئی آئے گا تو میرا خادم اور میرا شاگرد اور میرا تابع اور میرا ظل اور گویا میرے وجود کا حصہ ہو کر آئے گا۔ اور یہی وہ گہرا فلسفہ ہے جو ایک قرآنی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خاتم النبیین (نبیوں کی مہر) رکھ کر بیان کیا گیا ہے خوب غور کرو کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ والی مسجد کے بعد اسلامی ممالک میں کروڑوں مسجدوں کی تعمیر کے باوجود **مسجدی ھٰذا آخر المساجد** (یعنی میری یہ مسجد آخری مسجد ہے) کا مفہوم قائم رہتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں آپ کے کسی خادم اور شاگرد اور تابع کا آپ کی اتباع اور غلامی میں نبوت کا انعام پانا کس طرح ختم نبوت یا انی آخر الانبیاء (یعنی میں آخری نبی ہوں) کے منشاء کے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے؟ پس یقیناً اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ میں خدا کا آخری صاحب شریعت نبی ہوں۔ جس کے بعد کوئی نبی میری غلامی کے جوئے سے آزاد ہو کر اور میرے دین کو چھوڑ کر نہیں آسکتا اور میری یہ مسجد آخری مسجد ہے جس کے بعد کوئی اور مسجد میری مسجد کے مقابل پر نہیں بن سکتی۔ اور اگر غور کیا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع شان بھی اس بات میں نہیں ہے کہ آپ کو گزشتہ جاری شدہ نعمتوں کا بند کرنے والا قرار دیا جائے بلکہ آپ کی شان اس بات میں ہے کہ الگ الگ نہروں کو بند کر کے آئندہ تمام نہریں آپ کے وسیع دریا سے نکالی جائیں۔

یہی وہ لطیف تشریح ہے جو اسلام کے چوٹی کے علماء اور بڑے بڑے مجدد ہر زمانہ میں کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ صوفیاء کے سردار اور امام حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (ولادت ۵۶۰ھ وفات ۶۳۸ھ) فرماتے ہیں:۔

النبوة التی انقطعت بوجود رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انما ھی نبوة التشریع۔ (فتوحات مکیہ جلد ۲ صفحہ ۳)

''یعنی وہ نبوت جس کا دروازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے بند ہو گیا ہے وہ صرف شریعت والی نبوت ہے''۔

حضرت امام عبدالوہاب شعرانی (وفات ۹۷۶ھ) جو ایک بڑے امام مانے گئے ہیں فرماتے ہیں:۔ان مطلق النبوة لم ترتفع و انما ارتفعت نبوة التشریع (الیواقیت والجواہر جلد اوّل صفحہ ۲۴)

''یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے مطلق نبوت ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ صرف شریعت والی نبوّت بند ہوئی ہے''۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانی (وفات ۱۰۳۴ھ) جو اسلام کے مجددین میں نہایت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں فرماتے ہیں:۔

حصولِ کمالات نبوت مرتا بعاں را بطریق تبعیت و وراثت بعد از بعثتِ خاتم الرسل منافی ختمیت او نیست فلا تکن من الممترین۔ (مکتوبات احمد جلد۔ا۔مکتوب صفحہ ۲۷۱)

''یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے متبعین کیلئے آپؐ کی پیروی اور ورثہ میں نبوت کے کمالات کا حصول آپ کے خاتم النبیین ہونے کے منافی نہیں ہے پس تو اس بات میں شک کرنے والوں میں مت بن۔''

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مجدد وصدی دواز دہم (ولادت ۱۱۱۴ھ وفات ۱۱۷۶ھ) جن کے علم وفضل اور علو مرتبت کا سکہ دنیا مانتی ہے۔فرماتے ہیں:۔

ختم به النبیون ای یوجد بعده من یامره الله سبحانه بالتشریع علی الناس۔ (تفہیمات الہیہ تفہیم صفحہ ۵۳)

''یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے ختم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے بعد کوئی ایسا شخص نہیں آسکتا جسے خدا تعالیٰ کوئی نئی شریعت دے کر مبعوث کرے''۔

حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند (ولادت ۱۲۴۸ھ وفات ۱۲۹۷ھ) جو قریب کے زمانہ میں ہی بہت بڑے عالم گزرے ہیں اور ان کا مدرسہ علومِ مشرقیہ کی تعلیم کے لئے برعظیم ہندو پاکستان میں بہت بڑی شہرت کا مالک ہے فرماتے ہیں:۔

''عوام الناس کے خیال میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد ہے اور سب میں آخری نبی ہیں۔مگر اہلِ فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم وتاخر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں پھر مقام مدح میں ولکن رسول الله و خاتم النبیین فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟.....اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نبی پیدا ہوتو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔ (تحذیر الناس صفحہ ۳و۲۸)

پس لا ریب یہی نظریہ درست اور صحیح ہے کہ ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود میں نبوت اپنے کمال کو پہنچ چکی ہے اور دائمی شریعت کا نزول پورا ہو چکا ہے اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں مگر وہی جو آپ کا خوشہ چین بن کر آپ کی غلامی میں آپ کی مہر تصدیق کے ساتھ نبوت کے انعام کا وارث بنتا ہے۔کاش لوگ اس لطیف نکتہ کو سمجھیں۔

﴿ 5 ﴾

اعمال کا اجر نیّت کے مطابق ملتا ہے

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰی (بخاری)

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اعمال نیتوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی نیّت کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔

تشریح: یہ لطیف حدیث انسانی اعمال کے فلسفہ پر ایک اصولی روشنی ڈالتی ہے ظاہر ہے کہ بظاہر نیک نظر آنے والے اعمال بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں بعض کام محض عادت کے طور پر کئے جاتے ہیں اور بعض کام دوسروں کی نقل میں کئے جاتے ہیں اور بعض کام ریا اور دکھاوے کے طور پر کئے جاتے ہیں لیکن ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ سب کام خدائے اسلام کے ترازو میں بالکل بے وزن اور بے سود ہیں اور صحیح عمل وہی ہے جو دل کے سچے ارادہ اور نیت کے خلوص کے ساتھ کیا جائے۔ اور یہی وہ عمل ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے حقیقی جزا پانے کا مستحق ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ جب تک انسان کا دل اور اس کی زبان اور اس کی جوارح یعنی ہاتھ پاؤں وغیرہ کسی عمل کے بجا لانے میں برابر کے شریک نہ ہوں وہ عمل کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ دل میں سچی نیت ہو۔ زبان سے اس نیت کی

تصدیق ہو اور ہاتھ پاؤں اس نیت کے عملی گواہ ہوں۔ تو تب جا کر ایک عمل قبولیت کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں سچی نیت نہیں تو وہ منافق ہے۔ اگر اس کی زبان پر اس کی نیت کی تصدیق نہیں تو وہ بزدل ہے۔ اور اگر اس کے ہاتھ پاؤں اس کی بیان کردہ نیت کے مطابق نہیں تو وہ بد عمل ہے پس سچا عمل وہی ہے جس کے ساتھ سچی نیت شامل ہو۔ پاک نیت سے انسان اپنے بظاہر دنیوی اعمال کو بھی اعلیٰ درجہ کے دینی اعمال بنا سکتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک خاوند اس نیت سے اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالتا ہے کہ میرے خدا کا یہ منشاء ہے کہ میں اپنی بیوی کا خرچ مہیا کروں اور اس کے آرام کا خیال رکھوں تو اس کا یہ فعل بھی خدا کے حضور ایک نیکی شمار ہوگا مگر افسوس ہے کہ دنیا میں لاکھوں انسان صرف اس لئے نماز پڑھتے ہیں کہ انہیں بچپن سے نماز کی عادت پڑ چکی ہے اور لاکھوں انسان صرف اس لئے روزہ رکھتے ہیں کہ ان کے اردگرد کے لوگ روزہ دار ہوتے ہیں اور لاکھوں انسان صرف اس لئے حج کرتے ہیں کہ تا لوگوں میں ان کا نام حاجی مشہور ہو اور وہ نیک سمجھے جائیں اور ان کے کاروبار میں ترقی ہو۔ ہمارے آقا (فداہ نفسی) کی یہ حدیث ایسے تمام اعمال کو باطل قرار دیتی ہے اور ایک باطل عمل خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی نیک نظر آئے خدا کے حضور کوئی اجر نہیں پا سکتا۔ لاریب سچا عمل وہی ہے جس کے ساتھ سچی نیت ہو اور عمل کا اجر بھی نیت کے مطابق ہی ملتا ہے۔

﴿ 6 ﴾

خدا کی نظر دلوں پر ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ لَايَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ اَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ اَعْمَالِكُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور تمہارے مالوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کی طرف دیکھتا ہے۔

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دو باتوں کا ذکر فرمایا ہے جو خدا تعالیٰ کی نعمت ہونے کے باوجود بعض اوقات عورتوں اور مردوں میں بھاری فتنہ کا موجب بن جاتی ہیں۔ان میں سے ایک جسمانی حسن و جمال ہے جو عموماً عورتوں کے لئے فتنہ کی بنیاد بنتا ہے اور دوسرے مال و دولت ہے جو بالعموم مردوں کو فتنہ میں مبتلا کرتا ہے۔ان دو باتوں کو مثال کے طور پر سامنے رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ بیشک یہ دونوں چیزیں خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہیں ۔مگر مسلمانوں کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ کسی انسان کی قدر و قیمت کو پرکھنے کے لئے خدا تعالیٰ عورتوں کے حسن اور مردوں کے مال کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ ان دونوں کے دلوں اور دماغ کی طرف دیکھتا ہے جو انسانی خیالات اور جذبات کا مبدا و منبع ہیں اور پھر وہ ان کے

اعمال کی طرف دیکھتا ہے جو ان خیالات اور جذبات کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اس حدیث میں جو قلب کا لفظ بیان ہوا ہے اس سے دل اور دماغ دونوں مراد ہیں جنہیں انگریزی میں ہارٹ (heart) اور مائنڈ (mind) کہتے ہیں کیونکہ قلب کے لفظی معنی کسی نظام کے مرکزی نقطہ کے ہیں اور دل اور دماغ دونوں اپنے اپنے دائرہ میں جسمانی نظام کا مرکز ہیں دماغ ظاہری احساسات کا مرکز ہے اور دل روحانی جذبات کا مرکز ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ قلوب اور اعمال کا لفظ استعمال کر کے اشارہ فرمایا ہے کہ بیشک جسمانی حسن اور ظاہری مال و دولت بھی خدا کی نعمتیں ہیں اور انسان کو ان کی قدر کرنی چاہئے لیکن وہ چیز جس کی طرف خدا کی نظر ہے انسان کا قلب اور اسکے اعمال ہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جمال و مال اور دنیا کی دوسری نعمتوں پر فخر کرنے کی بجائے اپنے دل و دماغ کی اصلاح اور اپنے اعمال کی درستی کی فکر کرے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ انسان کے قلب اور اس کے اعمال کی طرف دیکھتا ہے اس سے صرف یہی مراد نہیں کہ قیامت والے حساب کتاب میں انہی چیزوں کو وزن حاصل ہوگا۔ بلکہ ان الفاظ میں یہ اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ اس دنیا میں بھی حقیقی وزن دل کے جذبات اور دماغ کے احساسات اور جوارح کے اعمال کو حاصل ہوتا ہے حق یہ ہے کہ جس قوم کے افراد کو یہ نعمت حاصل ہو جائے یعنی ان کا دل اور ان کا دماغ اور ان کے ہاتھ پاؤں ٹھیک رستہ پر چل دیں اس کی ترقی اور اس کے لئے نعمتوں کے حصول کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

﴿ 7 ﴾

مجاہد اور قاعد مسلمان میں درجہ کا فرق

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَامَ رَمَضَانَ کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰهِ اَنْ یُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ جَاهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ جَلَسَ فِیْ رَوْضَةِ الَّتِیْ وُلِدَ فِیْهَا ۔ قَالُوْا اَفَلَا نُبَشِّرُ النَّاسَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ اَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَا بَیْنَ الدَّرَجَتَیْنِ کَمَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَاِنَّهٗ اَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَاَعْلَی الْجَنَّةِ وَ فَوْقَهَا عَرْشُ الرَّحْمٰنِ وَ مِنْهَا یَتَفَجَّرُ اَنْهٰرُ الْجَنَّةِ ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جو شخص خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہے اور نماز قائم کرتا اور رمضان کے روزے رکھتا ہے۔ اس کے متعلق گویا اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے خواہ ایسا انسان خدا کے رستہ میں جہاد کرے یا کہ اپنے پیدائشی گھر کے باغیچہ میں ہی قاعد بن کر بیٹھا رہے۔ صحابہ نے عرض کیا تو کیا یا رسول اللہ ہم یہ بشارت لوگوں تک نہ پہنچائیں؟ آپ نے فرمایا جنت میں ایک سو درجے ایسے ہیں جنہیں خدا نے اپنے مجاہد بندوں کے لئے تیار کر رکھا ہے اور ہر درجہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پس اے مسلمانو! جب تم خدا سے جنت کی خواہش

کروتو فردوس والے درجہ کی خواہش کیا کرو۔ جو جنت کا سب سے وسطی اور سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور اس سے اوپر خدائے ذوالجلال کا عرش ہے اور اسی میں سے جنت کی تمام نہریں پھوٹتی ہیں۔

تشریح: ۔میں نے اپنے عام اصولِ انتخاب کے خلاف یہ لمبی حدیث اس لئے درج کی ہے کہ اس حدیث سے ہمیں کئی اہم اور مفید اور اصولی باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے اور وہ باتیں یہ ہیں:۔

(۱) یہ کہ جنت میں صرف ایک ہی درجہ نہیں ہے بلکہ بہت سے درجے ہیں۔جن میں سب سے اعلیٰ درجہ فردوس ہے جو گویا جنت کی نہروں کا منبع ہے۔

(۲) یہ کہ جنت میں مجاہد مسلمانوں کے کم سے کم درجہ اور قاعد مسلمانوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ میں بھی اتنا ہی فرق ہوگا جتنا کہ زمین اور آسمان میں فرق ہے۔

(۳) یہ کہ مسلمانوں کو نہ صرف مجاہدوں والا درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے بلکہ مجاہدوں والے درجوں میں سے سب سے اعلیٰ درجہ یعنی فردوس کو اپنا مقصد بنانا چاہئے۔

(۴) یہ کہ جنت کے مختلف درجے خدا تعالیٰ کے قرب کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہیں۔اسی لئے جنت کے اعلیٰ ترین درجہ کو عرشِ الٰہی کے قریب تر رکھا گیا ہے۔

(۵) یہ کہ جنت کی نعمتیں مادی نہیں ہیں بلکہ روحانی ہیں۔ کیونکہ ان کا معیار خدا کا قرب مقرر کیا گیا ہے۔اور گو ان نعمتوں میں روح کے ساتھ جسم کا بھی حصہ ہوگا۔جیسا کہ اعمال میں بھی اس کا حصہ ہوتا ہے مگر جنت میں انسان کا جسم بھی روحانی رنگ کا ہوگا۔اس لئے وہاں کی جسمانی نعمتیں بھی دراصل روحانی معیار کے مطابق بالکل پاک وصاف ہوں گی۔

یہ وہ لطیف علم ہے جو ہمیں اس حدیث سے حاصل ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ تا مسلمانوں کے مقصد اور آئیڈیل کو زیادہ سے زیادہ بلند کیا جائے۔ بیشک ایک مسلمان جو نماز اور روزہ کے احکام وغیرہ کو تو خلوص نیت سے پورا کرتا ہے (اس حدیث میں حج اور زکوٰۃ کے ذکر کو اس لئے ترک کیا گیا ہے کہ وہ ہر مسلمان پر واجب نہیں۔ بلکہ صرف مستطیع اور مالدار لوگوں پر واجب ہیں) مگر اپنے گھر میں قاعد بن کر بیٹھا رہتا ہے وہ خدا کی گرفت سے بچ کر نجات حاصل کر سکتا ہے۔ مگر وہ ان اعلیٰ انعاموں کو نہیں پا سکتا جو انسان کو خدا تعالیٰ کے قرب خاص کا حقدار بناتے ہیں۔ پس ترقی کی خواہش رکھنے والے مومنوں کا فرض ہے کہ وہ قاعدانہ زندگی ترک کر کے مجاہدانہ زندگی اختیار کریں۔ اور خدا کے دین اور اس کے رسول کی امت کی خدمت میں دن رات کوشاں رہیں۔ حق یہ ہے کہ ایک قاعد مسلمان جس کے دین کا اثر اور اس کے دین کا فائدہ صرف اس کی ذات تک محدود ہے۔ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ نعمتوں سے ہی محروم نہیں کرتا بلکہ اپنے لئے ہر وقت کا خطرہ بھی مول لیتا ہے کیونکہ بوجہ اس کے کہ وہ بالکل کنارے پر کھڑا ہے اس کی ذراسی لغزش اسے نجات کے مقام سے نیچے گرا کر عذاب کا نشانہ بنا سکتی ہے مگر ایک مجاہد مسلمان اس امکانی خطرہ سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ خدا کی راہ میں مجاہد بننے کا کیا طریق ہے سو گو جہاد فی سبیل اللہ کی بیسیوں شاخیں ہیں۔ مگر قرآن شریف نے دو شاخوں کو زیادہ اہمیت دی ہے چنانچہ فرماتا ہے فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً۔

’’یعنی خدا تعالیٰ نے دین کے رستہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ذریعہ جہاد کرنے والے لوگوں کو گھروں میں بیٹھ کر نیک اعمال بجالانے والوں پر بڑی فضیلت دی ہے‘‘۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کا بڑا ذریعہ مال اور جان ہے۔ مال کا جہاد یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت اور اسلام کی ترقی اور اسلام کی مضبوطی کے لئے بڑھ چڑھ کر روپیہ خرچ کیا جائے اور جان کا جہاد یہ ہے کہ اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت (یعنی تبلیغ اور تربیت وغیرہ) میں لگایا جائے۔ اور موقعہ پیش آنے پر جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ جو شخص ان دو قسموں کے جہادوں میں دلی شوق کے ساتھ حصہ لیتا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ان اعلیٰ انعاموں کا حقدار قرار پاتا ہے جو ایک مجاہد کے لئے مقدر ہیں۔ مگر گھر میں بیٹھ کر نماز روزہ کرنے والا مسلمان ایک قاعد والی بخشش سے زیادہ امید نہیں رکھ سکتا۔

اب دیکھو کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم پر کس درجہ شفقت ہے کہ ایک انتہائی طور پر رحیم باپ کی طرح فرماتے ہیں کہ بیشک تم نماز روزہ کے ذریعہ نجات تو پالو گے اور عذاب سے بچ جاؤ گے۔ مگر اپنے تخیل کو بلند کر کے ان انعاموں کو حاصل کرنے کی کوشش کرو جو ایک مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے مقدر کئے گئے ہیں کیونکہ اس کے بغیر قومی زندگی کا قدم کبھی بھی ترقی کی بلندیوں کی طرف نہیں اُٹھ سکتا بلکہ ایسی قوم کی زندگی ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔ اس تعلق میں سب سے مقدم فرض ماں باپ کا اور ان سے اُتر کر سکولوں کے اساتذہ اور کالج کے پروفیسروں کا ہے کہ وہ بچپن کی عمر سے ہی بچوں میں مجاہدانہ روح پیدا کرنے کی کوشش کریں اور انہیں قاعدانہ زندگی پر ہرگز قانع نہ ہونے دیں۔

﴿ 8 ﴾

ہر ناپسندیدہ بات دیکھ کر اصلاح کی کوشش کرو

عَنۡ اَبِیۡ سَعِیۡدٍ قَالَ سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ یَقُوۡلُ مَنۡ رَأَی مِنۡکُمۡ مُنۡکَرًا فَلۡیُغَیِّرۡہُ بِیَدِہٖ فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ فَبِقَلۡبِہٖ وَذٰلِکَ اَضۡعَفُ الۡاِیۡمَانِ۔ (مسلم)

ترجمہ: ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی خلافِ اخلاق یا خلافِ دین بات دیکھے تو اُسے چاہئے کہ اس بات کو اپنے ہاتھ سے بدل دے لیکن اگر اسے یہ طاقت حاصل نہ ہو تو اپنی زبان سے اس کے متعلق اصلاح کی کوشش کرے اور اگر اسے یہ طاقت بھی نہ ہو تو کم از کم اپنے دل میں اسے بُرا سمجھ کر (دعا کے ذریعہ) بہتری کی کوشش کرے اور آپ فرماتے تھے کہ یہ سب سے کمزور قسم کا ایمان ہے۔

تشریح: جہاں اوپر والی حدیث میں جہاد فی سبیل اللہ کی تحریک کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح ہر سچے مومن کو اپنے مال اور اپنی جان کے ذریعہ ہر وقت جہاد میں لگے رہنا چاہئے۔ وہاں اس حدیث میں جہاد کے بہت سے میدانوں میں سے ایک میدان کے متعلق جہاد کا طریق کار بیان کیا گیا ہے۔ یہ میدان قومی اور خاندانی اور انفرادی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہت سی دینی اور اخلاقی بدیاں اس لئے پھیلتی ہیں کہ لوگ

انہیں دیکھ کر خاموشی اختیار کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی قولی یا عملی قدم نہیں اٹھاتے۔اس طرح نہ صرف بدی کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے کیونکہ ایک شخص کے برے نمونہ سے بیسیوں مزید آدمی خراب ہوتے ہیں بلکہ لوگوں کے دلوں میں سے بدی کا رعب بھی کم ہونے لگتا ہے۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قانونی طریق کے علاوہ سوسائٹی میں سے بدی کو مٹانے کے دو ہی بڑے ذریعے ہیں۔ایک ذریعہ بزرگوں اور نیک لوگوں کی نگرانی اور نصیحت ہے جو بے شمار کمزور طبیعتوں کو سنبھالنے کا موجب ہو جاتی ہے اور دوسرا ذریعہ بدی کا وہ رعب اور ڈر ہے جو سوسائٹی کی رائے عامہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔اور یہ بھی لاتعداد لوگوں کو بدی کے ارتکاب سے روک دیتا ہے۔مثلاً ایک بچہ بدصحبت میں مبتلاء ہو کر خراب ہونے لگتا ہے۔مگر اس کے والد یا والدہ یا کسی اور نیک بزرگ کی بروقت نگرانی اور نصیحت اسے گرتے گرتے سنبھال لیتی ہے یا ایک شخص اپنے اندر ایک خاص قسم کی بدی کی طرف میلان پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے مگر اسے سوسائٹی کا رعب اور بدنامی کا ڈر اس میلان سے روک کر پھسلنے سے بچا لیتا ہے۔اسی طرح اگر عملی نگرانی یا قولی نصیحت نہ بھی ہو تو نیک لوگوں کی خاموش دعائیں بھی خاندانوں اور قوموں کی اصلاح میں بڑا کام کرتی ہیں پس اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں قسموں کے موجبات اصلاح کو حرکت میں لا کر مسلمانوں میں بدی کا رستہ بند کرنا اور نیکی کا رستہ کھولنا چاہتے ہیں۔دنیا میں اکثر لوگ ایسے سست اور غافل اور بے پرواہ ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا کوئی عزیز یا دوست یا ہمسایہ برملا طور پر ایک خلاف

اخلاق یا خلافِ دین حرکت کرتا ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اور یہ خیال کر کے کہ ہم کسی عزیز یا دوست کا دل میلا کیوں کریں یا ہم کسی سے جھگڑا مول کیوں لیں یا ہمیں دوسروں کے ذاتی اخلاق سے کیا سروکار ہے۔ بالکل بے حرکت بیٹھے رہتے ہیں اور بدی ان کی آنکھوں کے سامنے جڑ پکڑتی اور پودے سے پیڑ اور پیڑ سے درخت بنتی چلی جاتی ہے مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ جو آگ آج ان کے ہمسایہ کے گھر میں لگی ہے کل کو وہی وسیع ہو کر ان کے اپنے گھر کو بھی تباہ کر دے گی۔

الغرض ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال حکمت اور دُور اندیشی سے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ تم اپنے اردگرد بدی اور گناہ کی آگ دیکھ کر تماشہ بین بن کر نہ بیٹھے رہو بلکہ اولاً اپنے ہمسایہ کے گھر کو اور پھر خود اپنے گھر کو بھی اس آگ کی تباہی سے بچاؤ اور آپ نے اس تبلیغی اور تربیتی جدوجہد کو تین درجوں میں منقسم فرمایا ہے اوّل یہ کہ انسان کو اگر طاقت ہو تو بدی کو اپنے ہاتھ سے روک دے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو تو زبان کے ذریعہ نصیحت کر کے روکنے کی کوشش کرے۔ اور تیسرے یہ کہ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر دل کے ذریعہ سے روکے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اس جگہ ہاتھ سے روکنے سے غیر اور لاتعلق لوگوں کے خلاف تلوار چلانا یا جبر کرنا مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس پوزیشن میں ہو کہ اگر وہ کسی بدی کو اپنے ہاتھ کے زور سے بدل سکے تو اس کا فرض ہے کہ ایسا کرے مثلاً اگر ایک باپ اپنے بچے کو کسی غلط رستہ پر پڑتا دیکھے یا ایک افسر اپنے ماتحت کو یا آقا

اپنے نوکر کو بدی کے رستہ پر گامزن پائے تو اس کا فرض ہے کہ اپنے جائز اقتدار کے ذریعہ اس بدی کا سد باب کرے اور زبان سے روکنے سے نصیحت کرنا یا حسب ضرورت مناسب تنبیہ کے ذریعہ روکنا مراد ہے اور دل کے ذریعہ اصلاح کرنے سے محض خاموش رہ کر دل میں برا ماننا مراد نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''دل کے ذریعہ بدلنے یا روکنے'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں اور یہ غرض ہرگز محض دل میں برا ماننے کے ذریعہ پوری نہیں ہوسکتی۔ پس دل کے ذریعہ روکنے سے مراد دل کی دعا ہے جو اصلاح کا ایک تجربہ شدہ ذریعہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ ہے کہ اگر ایک انسان کسی بدی کو نہ تو ہاتھ سے روک سکے اور نہ ہی زبان سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو تو اسے چاہیئے کہ کم از کم دل کی دعا کے ذریعہ ہی اصلاح کی کوشش کرے اور یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دل کے ذریعے روکنے کی کوشش کرنا سب سے کمزور قسم کا ایمان ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ محض دل کی دعا پر اکتفا کرنا بہت کمزور قسم کی چیز ہے اصل مجاہد انسان وہی سمجھا جا سکتا ہے جو دل کی دعا کے ساتھ ساتھ خدا کی پیدا کردہ ظاہری تدابیر بھی اختیار کرتا ہے جو شخص محض دعا پر اکتفا کرتا ہے اور بدی کو روکنے کے لئے کوئی ظاہری تدبیر عمل میں نہیں لاتا وہ دراصل اصلاحِ نفس کے فلسفہ کو بہت کم سمجھا ہے۔ دعا میں بیشک بڑی طاقت ہے لیکن زیادہ مؤثر دعا وہ ہے جس کے ساتھ ظاہری تدبیر بھی شامل ہوتا کہ انسان نہ صرف اپنے قول سے بلکہ اپنے عمل کے ذریعہ بھی خدا کے فضل کا جاذب بن سکے۔

پس تمام سچے مسلمانوں کو چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک ارشاد پر عمل کریں۔ یعنی اگر ان کے سامنے کوئی ایسا شخص بدی کا مرتکب ہو جو

ان کا کوئی عزیز یا دوست یا ماتحت ہے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دیں اور اگر کوئی ایسا شخص بدی کا مرتکب ہونے لگے جسے ہاتھ سے روکنا ان کے اختیار میں نہیں بلکہ ہاتھ کے ذریعہ روکنا فتنہ کا موجب ہوسکتا ہے تو اسے زبان کی نصیحت سے روکنے کی کوشش کریں۔لیکن اگر اپنی کمزوری یا فتنہ کے خوف کی وجہ سے انہیں ان دونوں باتوں کی طاقت نہ ہوتو پھر کم از کم اس بدی کے استیصال کے لئے دل میں ہی سچی تڑپ کے ساتھ دعا کریں۔افراداور خاندانوں اورقوموں کی اصلاح کے لئے یہ تدبیر اتنی مفیداور اتنی مؤثراور اتنی بابرکت ہے کہ اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو ایک بہت قلیل عرصہ میں ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے لیکن بدی کے نظاروں کو تماشے کے رنگ میں دیکھنے والا انسان ہرگز سچا مسلمان نہیں سمجھا جاسکتا۔

﴿ 9 ﴾

جو بات اپنے لئے پسند کرتے ہو اپنے بھائی کے لئے پسند کرو

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص سچا مومن نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہیں کرتا جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تشریح:۔ یہ حدیث اسلامی اخوت کا حقیقی معیار پیش کرتی ہے سب سے پہلے قرآن شریف نے تمام مسلمانوں کو انما المومنون اخوۃ (یعنی تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کہہ کر بھائی بھائی بنایا اور اس کے بعد ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ الفاظ فرما کر جو اس حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔ اس اخوت کے بلند معیار کی وضاحت فرمائی آپ فرماتے ہیں اور کس شان کے ساتھ خدا کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ مومنوں کی اخوت کا حقیقی معیار یہ ہے کہ جو بات ایک مسلمان اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرے ان مختصر الفاظ

کے ذریعہ آپ نے گویا مسلمانوں میں ہر قسم کی دُوئی اور غیریت کی جڑھ کاٹ کر انہیں بالکل ایک جان کر دیا ہے مگر افسوس ہے کہ آج کل اکثر لوگ نفسانفسی کے مرض میں مبتلا ہو کر اپنے واسطے ہر خیر کو جمع کرنے اور دوسروں کو ہر خیر سے محروم کرنے کے درپے رہتے ہیں۔اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن شریف فرماتا ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْن وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْن اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ''یعنی دوسروں کا حق مارنے والے لوگوں پر افسوس ہے کہ جب وہ دوسروں سے اپنا حق وصول کرتے ہیں تو خوب بڑھا چڑھا کر لیتے ہیں لیکن جب خود دوسروں کا حق دینے لگتے ہیں تو اپنا ناپ کم کر دیتے ہیں کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ خدا کے سامنے کبھی پیش نہیں کئے جائیں گے''؟ اسلام اس نفسانفسی کی مرض کو جڑھ سے کاٹ کر حکم دیتا ہے کہ سچے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ جو کچھ اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کریں۔

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جو خاص حقوق شریعت نے قریبی رشتہ داروں کے لئے مقرر کر دئے ہیں انہیں ترک کر دیا جائے مثلاً باپ کا فرض ہے کہ چھوٹی عمر کی اولاد کے اخراجات کا کفیل ہو خاوند کا فرض ہے کہ بیوی کے اخراجات کو برداشت کرے۔بچوں کا فرض ہے کہ بوڑھے یا بے سہارا والدین کا بوجھ اٹھائیں۔ اسی طرح شریعت نے ایک شخص کے مرنے پر اس کے ورثاء کے حصے بھی مقرر کر دئے ہیں کہ بیوی کو اتنا حصہ ملے اور اولاد کو اتنا حصہ ملے۔اور ماں باپ کو اتنا حصہ ملے وغیرہ وغیرہ اور دوسرے رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں کا خاص خیال

رکھنے کی بھی تاکید فرمائی ہے پس یہ مقررہ حقوق تو بہرحال مقدم رہیں گے لیکن انہیں چھوڑ کر عام تعلقات اور معاملات میں اسلام ہر مسلمان سے توقع رکھتا اور اسے تاکیدی ہدایت دیتا ہے کہ جو بات وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی پسند کرے اور یہ نہ ہو کہ اپنے لئے تو اس کا پیمانہ اور ہو اور دوسروں کے لئے اور ہو۔ ایک دوسری حدیث میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمام مسلمان آپس میں ایک انسانی جسم کے اعضا کا رنگ رکھتے ہیں جس طرح جسم کے ایک عضو کے دُکھنے سے سارا جسم درد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کے دُکھ سے ساری قوم میں بے کلی اور بے چینی پیدا ہو جانی چاہئے۔ یہ وہ اخوت کا بلند معیار ہے جس پر خدا کا رسول (فداہ نفسی) ہمیں لے جانا چاہتا ہے کاش ہم اس تعلیم کی قدر کریں۔

﴿ 10 ﴾

بھائی خواہ ظالم ہو یا مظلوم اُس کی مدد کرو

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ هٰذَا نَنْصُرُهٗ مَظْلُوْمًا فَكَيْفَ نَنْصُرُهٗ ظَالِمًا قَالَ تَأْخُذَ فَوْقَ يَدَيْهِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اپنے مسلمان بھائی کی بہرحال امداد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا کہ مظلوم ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مظلوم بھائی کی مدد کا مطلب تو ہم سمجھ گئے مگر ظالم بھائی کی مدد کس طرح کی جائے؟ آپ نے فرمایا ظالم بھائی کی مدد اس کے ظلم کے ہاتھ کو روک کر کرو۔

تشریح:۔ یہ لطیف حدیث فلسفہ اخوت اور فلسفۂ اخلاق کا ایک نہایت گراں قدر مجموعہ ہے۔ فلسفہ اخوت کا پہلو تو یہ ہے کہ ایک مسلمان بھائی کی مدد ہر حال میں ہونی چاہئے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو اخوت وہ چیز نہیں جسے کسی حالت میں بھی فراموش یا نظر انداز کیا جائے جو شخص ہمارا بھائی ہے وہ ہر صورت میں ہماری مدد کا مستحق ہے اور اس کا ظالم یا مظلوم ہونا اس کے اس حق پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابل پر اس حدیث کے فلسفۂ اخلاق کا پہلو یہ ہے کہ خواہ ہمارا واسطہ غیر کے ساتھ ہو یا کہ بھائی کے ساتھ ہمارا ہر حال میں فرض ہے کہ دنیا سے ظلم اور بدی

کو مٹائیں اور نیکی اور انصاف کو قائم کریں کسی کے غیر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس پر ظلم کریں اور کسی کے بھائی ہونے کے یہ معنے نہیں کہ ہم ایک ظلم میں بھی اس کے معین و مددگار رہوں۔

اب غور کرو کہ بظاہر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے کس قدر مخالف اور کتنی متضاد نظر آتی ہیں۔ اگر ظالم بھائی کی مدد نہ کی جائے تو اخوت کی تاریں ٹوٹتی ہیں۔ اور اگر ظالم بھائی کی مدد کی جائے تو انصاف ہاتھ سے دینا پڑتا ہے لیکن ہمارے آقا (فداہ نفسی) نے ان متوازی نہروں کو جو بظاہر ہمیشہ ایک دوسرے سے جدا رہتی ہوئی نظر آتی ہیں حکمت و دانش مندی کی ایک درمیانی نہر کے ذریعہ اس طرح ملا دیا ہے کہ وہ گویا ایک جان ہو کر بہنے لگ گئی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اخوت ایک ایسا مقدس رشتہ ہے جو کسی حالت میں ٹوٹنا نہیں چاہئے۔ میرا بھائی خواہ اچھا ہے یا برا، نیک ہے یا بد۔ ظالم ہے یا مظلوم۔ بہرحال وہ میرا بھائی ہے۔ اور اس کی اخوت کی تاریں کسی حالت میں کاٹی نہیں جاسکتیں۔ لیکن خدائے اسلام ظلم کی بھی اجازت نہیں دیتا اور دشمن تک سے انصاف کا حکم فرماتا ہے۔ اس لئے ان دو باتوں کو اس طرح ملاؤ کہ بھائی کی تو بہرحال مدد کرو لیکن اس کے ظالم ہونے کی حالت میں اپنی مدد کی صورت کو بدل دو اگر وہ مظلوم ہے تو اس کے ساتھ ہو کر ظالم کا مقابلہ کرو۔ اور اگر وہ ظالم ہے تو اس کے ساتھ لپٹ کر اس کے ظلم کے ہاتھ کو مضبوطی کے ساتھ روکو۔ اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس سے عرض کرو کہ بھائی ہر حال میں میں تمہارے ساتھ ہوں مگر اسلام ظلم کی اجازت نہیں دیتا اس لئے میں تمھارے ہاتھ کو ظلم کی طرف بڑھنے نہیں دوں گا۔ یہ وہ مقدس اصول ہے جو اس لطیف حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا ہے۔

یہ خیال کرنا جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض زور دینے کی خاطر خاص قسم کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ورنہ مقصد یہی ہے کہ اگر تمہارا بھائی مظلوم ہے تو اس کی مدد کرو۔ اور اگر وہ ظالم ہے تو اس کے خلاف کھڑے ہو جاؤ۔ بالکل غلط اور حدیث کے حکیمانہ الفاظ کے ساتھ گویا کھیلنے کے مترادف ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی منشاء ہوتا تو آپ بڑی آسانی کے ساتھ فرما سکتے تھے کہ تم بہر حال ظلم کا مقابلہ کرو خواہ وہ تمھارے دشمن کی طرف سے ہو یا تمہارے بھائی کی طرف سے لیکن آپ نے ہرگز ایسا نہیں فرمایا۔ بلکہ آپ نے اس فرمان میں بظاہر دو متضاد باتوں کو ملا کر ایک نہایت لطیف اور اچھوتا نظریہ قائم فرمایا ہے جو یہ ہے کہ:-

۱۔ بھائی بہر حال مدد کا مستحق ہے۔

۲۔ ظلم کا بہر حال مقابلہ ہونا چاہئے۔

۳۔ اگر بھائی مظلوم ہو تو اس کی مدد کرو اور اگر بھائی ظالم ہو تو مدد کی نوعیت کو بدل کر اس کے ظلم کے ہاتھ کو روکو تا کہ اخوت بھی قائم رہے اور ظلم کا انسداد بھی ہو جائے۔

یہ وہ مرکب نظریہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر عرب کے صحرا سے اٹھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لیکن آج تک یورپ اور امریکہ کی کوئی ترقی یافتہ قوم بھی اس نظریہ کی بلندی کو نہیں پہنچ سکی۔ انہوں نے اگر کسی قوم کے ساتھ اخوت کا عہد باندھا تو اس اخوت کے اکرام میں بے پناہ ظلم کا دروازہ کھول دیا اور اگر بزعمِ خود کسی ظلم کے انسداد کے لئے اٹھے تو اخوت کے عہد کی دھجیاں اڑا دیں۔

﴿ 11 ﴾

اسلام میں اطاعت کا بلند معیار

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيْمَا اَحَبَّ وَلَوْ كَرِهَ اِلَّا اَنْ يُّؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَاِنْ اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (بخاری)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر مسلمان پر اپنے افسروں کی ہر بات سننا اور ماننا فرض ہے خواہ اسے ان کا کوئی حکم اچھا لگے یا برا لگے۔سوائے اس کے کہ وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں جس میں خدا اور رسول کے کسی حکم کی (یا کسی بالا افسر کے حکم کی) نافرمانی لازم آتی ہو۔اگر وہ ایسی نافرمانی کا حکم دیں تو پھر اس میں ان کی اطاعت فرض نہیں۔

تشریح:۔ یہ حدیث اسلامی معیار اطاعت کا بنیادی اصول پیش کرتی ہے اسلام ایک انتہا درجہ کا نظم وضبط والا مذہب ہے۔وہ کسی شخص کو اپنے حلقہ میں جبراً داخل کرنے کا مؤید نہیں اور صاف اعلان کرتا ہے کہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں) لیکن جب کوئی شخص خوشی اور شرح صدر کے ساتھ اسلام قبول کرتا ہے تو پھر اسلام اس سے اس نظم وضبط کی توقع رکھتا ہے جو ایک منظّم قوم کے شایانِ شان ہے وہ اپنے ہر فرد کو کامل اطاعت کا نمونہ بنانا چاہتا ہے۔اور افسروں

کے حکموں پر حیل و حجت کی اجازت نہیں دیتا کہ جو حکم پسند ہوا وہ مان لیا اور جو ناپسند ہوا اس کا انکار کر دیا ''سنو اور مانو'' اسلام کا ازلی نعرہ رہا ہے مسلمان کے اس ضابطۂ اطاعت میں صرف ایک ہی استثناء ہے اور وہ یہ کہ اسے کسی ایسی بات کا حکم دیا جائے جو صریح طور پر خدا اور اس کے رسول یا کسی بالا افسر کے حکم کے خلاف ہو۔ اس کے علاوہ ہر حکم میں خواہ وہ کچھ ہو اور کیسے ہی حالات میں دیا جائے ''سنو اور مانو'' کا اٹل قانون چلتا ہے۔

اور یہ جو اس حدیث میں **الطاعة** (یعنی مانو) کے لفظ کے ساتھ السمع (یعنی سنو) کے لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس میں اس لطیف حکمت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ایک مسلمان کا کام صرف منفی قسم کی اطاعت نہیں ہے کہ جو حکم اسے پہنچ جائے وہ اسے مان لے اور بس بلکہ اسے مثبت قسم کی شوق امیز اطاعت کا نمونہ دکھانا چاہئے اور گویا اپنے افسروں کی طرف کان لگائے رکھنا چاہئے کہ کب ان کے منہ سے کوئی بات نکلے اور کب میں اسے مانوں۔ ورنہ محض اطاعت کے لئے **الطاعة** (یعنی مانو) کا لفظ بولنا کافی تھا۔ اور السمع (یعنی سنو) کا لفظ زیادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس لفظ کا زیادہ کرنا یقیناً اسی غرض سے ہے کہ تا رسمی اطاعت کی بجائے شوق آمیز اطاعت کا معیار قائم کیا جائے۔ پس اسلامی ضابطۂ اطاعت کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ ہر امر میں اپنے افسر کے حکم کی اطاعت کرو۔ خواہ اس کا کوئی حکم تمہیں پسند ہو یا ناپسند ہو۔

۲۔ اپنے افسر کی طرف شوق کے ساتھ کان لگائے رکھو تا کہ اس کا کوئی حکم

تمہاری تعمیل سے باہر نہ رہ جائے۔

۳۔لیکن اگر تمہارا افسر کسی ایسی بات کا حکم دے جو خدا تعالیٰ اور اس کے رسول یا کسی بالا افسر کے حکم کے صریح خلاف ہے تو پھر جہاں تک اس کے حکم کا تعلق ہے۔اس کی اطاعت نہ کرو۔

﴿ 12 ﴾

ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے

عَنْ طَارِقِ بْنِ شَهَابٍ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صلّی اللہ علیہ وسلم وَقَدْ وَضَعَ رِجْلَهٗ فِی الْغَرْزِ اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ قَالَ کَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ (نسائی)

ترجمہ: طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک شخص نے ایسے وقت میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ جب آپ ایک سفر پر جاتے ہوئے رکاب میں پاؤں ڈال رہے تھے۔ اس نے پوچھا یا رسول اللہ کون سا جہاد افضل ہے؟ آپ نے فرمایا ''انصاف کے رستہ سے بھٹکتے ہوئے بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا''۔

تشریح: اگر ایک طرف اسلام نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے امیر یا حاکم کی اطاعت کا اعلیٰ نمونہ دکھائیں اور اس کے احکام کو توجہ سے سنیں اور شرح صدر سے بجالائیں۔ تو دوسری طرف اس نے ماتحتوں کا بھی یہ فرض مقرر کیا ہے کہ اگر ان کا بادشاہ یا امیر یا حاکم (کیونکہ اس جگہ سلطان کے مفہوم میں یہ سب لوگ شامل ہیں) انصاف کے رستہ سے بھٹکنے لگے اور ظلم کا طریق اختیار کرے تو وہ اخلاقی جرأت سے کام لے کر اسے نیک مشورہ دیں۔ اور حاکم کے رویہ میں اصلاح کی کوشش کرے ملک میں عدل و انصاف کو قائم کرنے میں مدد دیں۔ اور چونکہ جائر اور غصہ میں آئے

ہوئے حاکم کو نیکی کا مشورہ دینا غیر معمولی جرأت چاہتا ہے اور بعض اوقات خطرہ سے بھی خالی نہیں ہوتا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کوشش کو افضل جہاد کے نام سے موسوم کیا ہے۔

حق یہ ہے کہ اسلام نے حاکم اور محکوم اور راعی اور رعیت کے حقوق میں ایسا لطیف توازن قائم کیا ہے کہ اس معاملہ میں اس سے بڑھ کر کوئی اور تعلیم خیال میں نہیں آسکتی۔ سب سے اول نمبر پر اسلام نے بلا امتیاز قوم وملت یہ ہدایت دی ہے کہ حکومت کے تمام عہدے (جس میں حاکم اعلیٰ سے لے کر سب سے نیچے کا افسر بھی شامل ہے) صرف اہلیت کی بناء پر تقسیم ہونے چاہئیں چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ "یعنی حکومت کے تمام عہدے ایک مقدس امانت ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ یہ امانت صرف اہلیت رکھنے والے لوگوں کے سپرد کیا کرو۔ اور پھر جو لوگ حاکم مقرر ہوں ان کا فرض ہے کہ کامل عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کریں" اس کے بعد دوسرے نمبر پر اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ لوگوں کا فرض ہے کہ اپنے حاکموں کی پوری پوری اطاعت کریں اور ان کے احکام کو توجہ کے ساتھ سنیں اور شوق کے ساتھ بجالائیں اور پھر تیسرے نمبر پر اسلام یہ ہدایت فرماتا ہے کہ اگر کوئی حاکم انصاف کے رستہ سے ہٹنے لگے تو ماتحتوں کا فرض ہے کہ بروقت نیک مشورہ دے کر اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ کیونکہ امن کے لحاظ سے یہ مشورہ ایک اعلیٰ قسم کے جہاد سے کم نہیں۔ لیکن چونکہ بعض ماتحت لوگ اس معاملہ میں خودداری یا جلد بازی یا ناواجب رقابت یا ذاتی رنجش کے طریق پر غلط قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس

لئے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرعون کے معاملہ میں حضرت موسیٰ کو فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (یعنی فرعون کے ساتھ نرم انداز میں بات کرنا) کے الفاظ میں ہدایت فرماتا ہے۔ اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ ایسے امور میں کوئی خلافِ آداب طریق یا گستاخی کا انداز یا بغاوت کا رنگ اختیار نہیں کرنا چاہئے بلکہ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں صراحت آئی ہے اگر بعض مظالم برداشت کر کے بھی صبر سے کام لیا جاسکے تو وہ بہتر ہے تا کہ ملک کا امن اور قوم کا اتحاد خطرہ میں نہ پڑے اور یہی وہ وسطی تعلیم ہے جو دنیا میں حقیقی امن کی بنیاد بن سکتی ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ حاکموں کو نیک مشورہ دینے اور انہیں عدل و انصاف کے مقام پر قائم رکھنے کی بجائے آج کل اکثر لوگ افسروں کو بگاڑنے کا طریق اختیار کرتے ہیں اور ایک طرف جھوٹی خوشامد کے ذریعہ اور دوسری طرف رشوت کے ناپاک وسیلہ سے حاکموں کے اخلاق اور ان کے جذبۂ انصاف کو تباہ کرنے کے درپے رہتے ہیں حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے اور ایک دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ الراشی والمرتشی کلاھما فی النار ’’یعنی رشوت دینے والا شخص اور رشوت لینے والا شخص دونوں آگ کا ایندھن ہیں‘‘ کاش اسلامی ممالک تو اس لعنت سے آزاد ہوسکیں۔

﴿ 13 ﴾

چھوٹوں پر رحم کرو اور بڑوں کے حق کو پہچانو

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا فَلَيْسَ مِنَّا (ابو داؤد)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جو شخص ہم میں سے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہم میں سے بڑوں کا حق نہیں پہچانتا۔ اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

تشریح: اس حدیث میں باہمی تعلقات کا ایک لطیف گُر بیان کیا گیا ہے۔ دنیا میں اکثر فسادات اور جھگڑے اس لئے ہوتے ہیں کہ بڑے لوگ چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور رحم کا سلوک نہیں کرتے اور چھوٹے لوگ بڑوں کے واجبی احترام سے غافل رہتے ہیں اور اس طرح ایک ناگوار طبقاتی کش مکش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسلام نے ایک طرف تو سرکاری عہدوں اور دولت پیدا کرنے کے ذرائع کے حصول میں سب کے واسطے برابر کے حقوق تسلیم کئے اور دوسری طرف سوسائیٹی کے مختلف طبقات میں ایک طرف سے شفقت و رحمت اور دوسری طرف سے ادب واحترام کا مضبوط پل باندھ کر سب کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ جن لوگوں کو زندگی کی جدوجہد میں دوسروں سے آگے نکلنے کا موقعہ میسر آجاتا ہے ان کے لئے حکم ہے کہ وہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ جب تک کہ وہ پیچھے ہیں شفقت و رحم کا سلوک

کریں اور جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں ان کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ آگے نکل جانے والوں کے ساتھ جب تک کہ وہ آگے ہیں واجبی ادب واحترام سے پیش آئیں۔اس زریں ہدایت کے ذریعہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے سوسائیٹی کے مختلف طبقات کے درمیان ناواجب کش مکش کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس تعلیم پر عمل کرتے ہیں۔اگر کسی شخص کو کسی وجہ سے کوئی طاقت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ تکبر میں مبتلاء ہو کر اپنے سے نیچے کے لوگوں کو کچل دینے کا متمنی ہوتا ہے۔اور اگر کوئی شخص زندگی کی دوڑ میں کسی وجہ سے پیچھے رہ جاتا ہے تو وہ حسد میں جل کر آگے نکل جانے والوں کو نیچے گرانے اور تباہ کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔یہ دونوں قسم کے لوگ اسلام کی منصفانہ تعلیم سے کوسوں دور ہیں۔

اسلام یقیناً طبقات پیدا نہیں کرتا مگر جو وقتی امتیاز افراد کے دماغی قویٰ یا ذاتی جدوجہد کے فرق کی وجہ سے خودبخود طبعی رنگ میں پیدا ہو جاتا ہے وہ جب تک اسی قسم کے طبعی طریق پر دور نہ ہو اسلام اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے حقائق کو نظر انداز بھی نہیں کرتا۔بلکہ اسے اپنے نوٹس میں لا کر اس کے ناگوار نتائج کو روکنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد انہی تدابیر کا حصہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام اس بات پر بھی زور دیتا چلا جاتا ہے کہ اس قسم کے امتیازات محض عارضی ہوا کرتے ہیں اور آج جو طبقہ نیچے ہے کل کو وہ ترقی کر کے اوپر آ سکتا ہے چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے لا یسخر قوم من قوم عسٰی اَنْ یکونوا خَیْرًا منھم ''یعنی سوسائٹی کے کسی طبقہ کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے طبقہ کو ادنیٰ خیال کر کے اُسے تحقیر کی نظر سے دیکھے۔کیونکہ

جوطبقہ نیچے ہے کل کو وہی طبقہ اوپر آ کر تحقیر کرنے والوں سے بہتر بن سکتا ہے‘‘۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس حدیث میں جو صغیر اور کبیر کا لفظ آتا ہے اس سے عربی محاورہ کے مطابق ہر قسم کے چھوٹے بڑے مراد ہیں۔خواہ یہ فرق اثر ورسوخ کے لحاظ سے ہو یا افسری ماتحتی کے لحاظ سے ہو یا دولت کے لحاظ سے یا رشتہ کے لحاظ سے ہو یا عمر کے لحاظ سے ہو۔ بہرحال جس جہت سے بھی فرق ہوگا۔ ہر بڑے کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے چھوٹے کے ساتھ شفقت ومحبت کا سلوک کرے۔اور ہر چھوٹے کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے سے بڑے کے ساتھ واجبی ادب واحترام سے پیش آئے۔اور جو شخص ایسا نہیں کرتا اس کے متعلق ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ’’لَیْسَ مِنَّا‘‘ وہ ہم میں سے نہیں۔

﴿ 14 ﴾

شرک اور والدین کی نافرمانی اور جھوٹ سب سے بڑے گناہ ہیں

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ ثَلَاثًا قَالُوْا بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَ عَقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَجَلَسَ وَکَانَ مُتَّکِئًا فَقَالَ اَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ فَمَا زَالَ یُکَرِّرُھَا حَتّٰی قُلْنَا لَیْتَہٗ سَکَتَ (بخاری)

ترجمہ: ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں پر مطلع نہ کروں؟ (اور صحابہ کو متوجہ کرنے کے لئے) آپ نے یہ الفاظ تین دفعہ دوہرائے۔صحابہ نے عرض کیا۔ہاں یارسول اللہ آپ ضرور ہمیں مطلع فرمائیں۔آپ نے فرمایا تو پھر سنو کہ سب سے بڑا گناہ خدا تعالیٰ کا شرک ہے اور پھر دوسرے نمبر پر سب سے بڑا گناہ والدین کی نافرمانی اور ان کی خدمت کی طرف سے غفلت برتنا ہے اور پھر....اور یہ بات کہتے ہوئے آپ تکیہ کا سہارا چھوڑ کر جوش کے ساتھ بیٹھ گئے اور پھر فرمایا....اچھی طرح سن لو کہ اس کے بعد سب سے بڑا گناہ جھوٹ بولنا ہے اور آپ نے اپنے ان آخری الفاظ کو اتنی دفعہ دوہرایا کہ ہم نے آپ کی تکلیف کا خیال کرتے

ہوئے دل میں کہا کہ کاش اب آپ خاموش ہو جائیں اور اتنی تکلیف نہ اٹھائیں۔

تشریح: اس زوردار حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑے گناہوں کا ذکر فرماتے ہوئے تین ایسی باتوں کو چنا ہے جو روحانیات اور اخلاقیات کے تین مختلف میدانوں کی بنیادی باتیں ہیں یہ تین میدان (۱) حقوق اللہ اور (۲) حقوق العباد اور (۳) اصلاح نفس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے بڑا گناہ شرک ہے یعنی خدا کے مقابل پر جو ہمارا خالق بھی ہے اور مالک بھی ہے۔ کسی ایسی ہستی کو کھڑا کرنا جو نہ تو ہمارا خالق ہے اور نہ مالک۔ اس لئے شرک کا گناہ دراصل غداری اور بغاوت دونوں کا مجموعہ ہے۔ یہ انتہاء درجہ کی غداری ہے کہ جس ہستی نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری دینی اور دنیوی ترقی کے اسباب مہیا کئے اس کے مقابل پر ایسی ہستیوں کے ساتھ تعلق قائم کیا جائے جن کا نہ تو ہماری پیدائش کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ ہماری بقاء کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ ہے اور پھر یہ انتہاء درجہ کی بغاوت بھی ہے کہ دنیا کے حقیقی مالک اور حقیقی حکمران کی حکومت سے سرتابی کر کے ایسی ہستیوں کے سامنے سر جھکایا جائے جنہیں ہم پر کسی نوع کا ذاتی تصرف حاصل نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی ایسی قومیں پائی جاتی ہیں جن کا دامن ان کی بظاہر اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ تہذیب کے باوجود شرک کی نجاست سے پاک نہیں۔ چنانچہ عیسائی اقوام حضرت مسیح ناصری کو (جن میں دوسرے نبیوں سے ہرگز کوئی زائد بات نہیں تھی) خدا مان کر اب تک شرک کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں اور ہندوؤں کے ہزاروں دیوتا تو ایک کھلی ہوئی کہانی کا حصہ ہیں جسے بچہ بچہ جانتا ہے۔

دوسرا بڑا گناہ اس حدیث میں عقوق الوالدین بیان کیا گیا ہے عقوق کے معنی

عربی زبان میں کسی چیز کو کاٹنے کے ہیں اور اصطلاحی طور پر اس کے معنی ماں باپ کی نافرمانی کرنا ان کا واجبی ادب ملحوظ نہ رکھنا ان کے ساتھ شفقت سے پیش نہ آنا اور ان کی خدمت سے غفلت برتنا ہے۔والدین کی اطاعت اور خدمت کا فریضہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اور دنیا کے حقوق میں غالباً سب سے زیادہ مقدس حق قرار دیا گیا ہے۔حتٰی کہ ایک دوسری حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماں باپ کی خوشی میں خدا کی خوشی ہے اور ماں باپ کی ناراضگی میں خدا کی ناراضگی ہے اور ایک اور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اپنے والدین کے بڑھاپے کا زمانہ پایا اور پھر اس نے ان کی خدمت کے ذریعہ اپنے واسطے جنت کا رستہ نہیں کھولا۔وہ بڑا ہی بدقسمت انسان ہے اور آپ کا ذاتی اسوہ اس معاملہ میں یہ ہے کہ جب ایک دفعہ آپ کچھ مال تقسیم فرمانے میں مصروف تھے تو آپ کی رضائی والدہ آپ سے ملنے کے لئے آئیں (آپ کی حقیقی والدہ آپ کے بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھیں) آپ انہیں دیکھتے ہی میری ماں میری ماں کہتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔اُن کے لئے اپنی چادر بچھا کر انہیں بڑی محبت اور عزت کے ساتھ بٹھایا الغرض اسلام نے والدین کی اطاعت اور خدمت کے متعلق انتہائی تاکید فرمائی ہے حتٰی کہ قرآن شریف میں آتا ہے کہ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا ”یعنی تم اپنے ماں باپ کے سامنے عاجزی اور انکساری کے بازوؤں کو محبت اور رحمت کے ساتھ جھکائے رکھو اور ان کے لئے ہمیشہ خدا سے دعا مانگتے رہو کہ خدایا جس طرح میرے والدین نے مجھے بچپن میں جبکہ میں بالکل بے سہارا تھا۔محبت اور شفقت کے ساتھ پالا۔اسی طرح اب تو ان کے

بڑھاپے میں ان پر شفقت ورحم کی نظر رکھ''۔

تیسرا بڑا گناہ اس حدیث میں جھوٹ بولنا بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے متعلق اسلام کا نظریہ اس حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ جب آپ جھوٹ کا ذکر فرمانے لگے تو جوش کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئے اور ان الفاظ کو بار بار دوہرایا کہ الا و قول الزور الا و قول الزور ''یعنی کان کھول کر سن لو۔ ہاں پھر کان کھول کر سن لو کہ شرک اور عقوق والدین کے بعد سب سے بڑا گناہ جھوٹ بولنا ہے''۔ حق یہ ہے کہ اگر باقی باتیں اس بیج کا حکم رکھتی ہیں جن سے گناہ کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ تو جھوٹ اس بیج کے واسطے پانی کے طور پر ہے جس کی وجہ سے یہ درخت پنپتا اور ترقی کرتا ہے۔ یہ جھوٹ ہی ہے جس کی وجہ سے گناہ پر دلیری پیدا ہوتی اور انسان گناہ کے دلدل میں پھنسے رہنے کا ایک بہانہ حاصل کر لیتا ہے کیونکہ جھوٹ کے ذریعہ گناہ پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور پھر اس پردہ کی اوٹ میں گناہ بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ پس جھوٹ صرف اپنی ذات میں ہی گناہ نہیں ہے بلکہ دوسرے گناہوں کے واسطے ایک بدترین قسم کا سہارا بھی ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو شرک اور عقوق والدین کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک مسلمان نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ میرا نفس کمزور ہے اور میں بہت سی کمزوریوں میں مبتلا ہوں۔ اور میں سارے گناہوں کو یکدم چھوڑنے کی ہمت نہیں پاتا۔ آپ مجھے ہدایت فرمائیں کہ میں سب سے پہلے کس گناہ کو چھوڑوں؟ آپ نے فرمایا جھوٹ بولنا چھوڑ دو' اس نے اس کا وعدہ کیا۔ اور گھر واپس آ گیا۔ پھر جب وہ اپنی عادت کے مطابق بعض دوسرے گناہوں کا ارتکاب

کرنے لگا تو اسے خیال آیا کہ اب اگر رسول اللہ تک میری یہ بات پہنچی اور آپ نے مجھ سے پوچھا تو جھوٹ تو بہر حال میں نے بولنا نہیں میں آپ کو کیا جواب دوں گا؟ یا اگر کسی مسلمان کو میری کسی کمزوری کا علم ہوا تو اس کے سامنے میں اپنے اس گناہ پر کس طرح پردہ ڈالوں گا؟ آخر اسی میں اس نے سوچتے سوچتے فیصلہ کیا کہ جب چھوڑ دیا ہے تو اب یہی بہتر ہے کہ سارے گناہوں سے ہی اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ وہ جھوٹ چھوڑنے کی برکت سے سب گناہوں سے نجات پا گیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال حکمت سے جھوٹ کے گناہ کو شرک اور عقوق والدین کے گناہوں کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دے کر مسلمانوں کی اصلاح کا ایک ایسا نفسیاتی نکتہ بیان فرمایا ہے جس کے ذریعہ وہ بہت جلد اپنے گناہوں پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جھوٹ ایک بدترین اور ذلیل ترین قسم کا گناہ ہے اور ہر شریف انسان کا فرض ہے کہ اخلاقی گناہوں میں سب سے پہلے جھوٹ پر غلبہ پانے کی کوشش کرے۔

لیکن ضمناً یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جھوٹ نہ بولنے کی تعلیم سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہر حال میں سچی بات بلا ضرورت بیان کر دی جائے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ جو بات بیان کی جائے وہ بہر حال سچی اور جھوٹ کی آمیزش سے پاک ہونی چاہئے۔ ورنہ بسا اوقات قومی یا خاندانی یا ذاتی مصالح بعض باتوں میں رازداری کے متقاضی ہوتے ہیں اور رازداری ہرگز راست گفتاری کے خلاف نہیں۔

﴿ 15 ﴾

اولاد کا بھی اکرام کرو اور انہیں بہترین تربیت دو

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ يُحَدِّثُ عَنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَكْرِمُوْا اَوْلَادَكُمْ وَاَحْسِنُوْا اَدَبَهُمْ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اپنی اولاد کی بھی عزت کیا کرو اور ان کی تربیت کو بہترین قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرو۔

تشریح: اسلام نے جہاں والدین کا حق اولاد پر تسلیم کیا ہے اور اولاد کو ماں باپ کی عزت اور خدمت کی انتہائی تاکید فرمائی ہے۔ وہاں والدین کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ بھی اپنی اولاد کا واجبی اکرام کریں اور ان کے ساتھ ایسا رویہ رکھیں جس سے ان کے اندر وقار اور عزت نفس کا جذبہ پیدا ہو اور پھر ان کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی خاص توجہ دیں تاکہ وہ بڑے ہو کر حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بہترین صورت میں ادا کر سکیں اور ترقی کا موجب ہوں۔

حق یہ ہے کہ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ بلکہ کوئی قوم تنزل سے بچ نہیں سکتی جب تک کہ اس کے افراد اپنی اولاد کو اپنے سے بہتر حالت میں چھوڑ کر نہ جائیں۔ اگر ہر باپ اس بات کا اہتمام کرے کہ وہ اپنی اولاد کو علم و عمل دونوں میں اپنے سے بہتر حالت میں چھوڑ کر جائے گا تو یقیناً قوم کا ہر اگلا قدم ہر پچھلے قدم سے

اونچا اٹھے گا اور ایسی قوم خدا کے فضل سے تنزل کے خطرات سے محفوظ رہے گی۔مگر افسوس ہے کہ اکثر والدین اس زریں اصول کو مدنظر نہیں رکھتے۔جس کی وجہ سے کئی بچے ماں باپ سے بہتر ہونا تو درکنار ایسی حالت میں پرورش پاتے ہیں کہ گویا ایک زندہ انسان کے گھر میں مردہ بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ایسے ماں باپ بچوں کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کا تو خیال رکھتے ہیں اور کسی حد تک ان کی تعلیم کا بھی خیال رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی اقتصادی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے مگر ان کی تربیت کی طرف سے عموماً ایسی غفلت برتتے ہیں کہ گویا یہ کوئی قابل توجہ چیز ہی نہیں۔حالانکہ تربیت کا سوال تعلیم کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے۔ایک کم تعلیم یافتہ مگر اچھے اخلاق کا انسان جس میں محنت اور صداقت اور دیانت اور قربانی اور خوش خلقی کے اوصاف پائے جائیں اس اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان سے یقیناً بہتر ہے جس کے سر پر گدھے کی طرح علم کا بوجھ تو لدا ہوا ہے مگر وہ اعلیٰ اخلاق سے عاری ہے اور قرآن شریف نے جو لا تقتلوا اولاد کم (یعنی اپنی اولاد کو قتل نہ کرو) کے الفاظ فرمائے ہیں۔ان میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اگر تم اپنے بچوں کی عمدہ تربیت اور اچھی تعلیم کا خیال نہیں رکھو گے تو تم گویا انہیں قتل کرنے والے ٹھہرو گے۔

باقی رہا اس حدیث کا دوسرا حصہ یعنی اولاد کا اکرام کرنا۔سو یہ بات وہ ہے جس میں اسلام کے سوا کسی دوسری شریعت نے توجہ ہی نہیں دی کیونکہ دنیا کے کسی اور مذہب نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا کہ اولاد کے واجبی اکرام کے بغیر بچوں کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔بعض نادان والدین بچوں کی محبت کے باوجود ان کے ساتھ بظاہر ایسا پست اور عامیانہ سلوک کرتے اور گالی گلوچ سے کام لیتے ہیں کہ

ان کے اندر وقار اور خود داری اور عزت نفس کا جذبہ ٹھٹھر کر ختم ہو جاتا ہے۔ پس ہمارے آقا (فداہ نفسی) کی یہ تعلیم درحقیقت سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی واجبی اکرام سے پیش آنا چاہئے۔ تا ان کے اندر باوقار انداز اور اعلیٰ اخلاق پیدا ہو سکیں۔ کاش ہم لوگ اس حکیمانہ تعلیم کی قدر پہچانیں۔

﴿ 16 ﴾

بیوی کے انتخاب میں دینی پہلو کو مقدم کرو

عَنۡ اَبِیۡ هُرَيۡرَةَ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ تُنۡكَحُ الۡمَرۡأَةُ لِاَرۡبَعٍ لِمَالِهَا وَ لِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيۡنِهَا فَاظۡفَرۡ بِذَاتِ الدِّيۡنِ تَرِبَتۡ يَدَاكَ (بخاری)

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ بیوی کے انتخاب میں عموماً چار باتیں مدنظر رکھی جاتی ہیں۔ بعض لوگ تو کسی عورت کے مال و دولت کی وجہ سے اس کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کرتے ہیں اور بعض لوگ عورت کے خاندان اور حسب و نسب کی وجہ سے شادی کے خواہاں ہوتے ہیں اور بعض لوگ عورت کے حسن و جمال پر اپنے انتخاب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اور بعض لوگ عورت کے دین اور اخلاق کی وجہ سے بیوی کا انتخاب کرتے ہیں سوائے مرد مسلم! تو دین دار اور با اخلاق رفیقۂ حیات چن کر اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش کرو ورنہ تیرے ہاتھ ہمیشہ خاک آلود رہیں گے۔

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتانے کے بعد کہ دنیا میں عام طور پر بیوی کا انتخاب کن اصولوں پر کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے انتخاب میں دین اور اخلاق کے پہلو کو مقدم رکھا کریں آپ فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں ان کی اہلی زندگی کامیاب اور بابرکت رہے

گی۔ورنہ خواہ وہ وسطی اور عارضی خوشی حاصل کر لیں انہیں کبھی بھی حقیقی اور دائمی راحت نصیب نہیں ہوسکتی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد نہایت گہری حکمت پر مبنی ہے کیونکہ اس میں نہ صرف مسلمانوں کی اہلی زندگی کو بہترین بنیاد پر قائم کرنے کا رستہ کھولا گیا ہے بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کی حفاظت اور ترقی کا سامان بھی مہیا کیا گیا ہے۔مگر افسوس ہے کہ دوسری اقوام تو الگ رہیں خود مسلمانوں میں بھی آج کل کثیر حصہ ان لوگوں کا ہے جو بیوی کا انتخاب کرتے ہوئے یا تو دین اور اخلاق کے پہلو کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتے ہیں اور یا دین اور اخلاق کی نسبت دوسری باتوں کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں کوئی شخص تو عورت کے حسن پر فریفتہ ہو کر باقی باتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور کوئی اس کے حسب ونسب کا دلدادہ بن کر دوسری باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔اور کوئی اس کی دولت کی لالچ میں آکر اس کے ہاتھ پر بک جانا چاہتا ہے حالانکہ اصل چیز جو اہلی زندگی کی دائمی خوشی کی بنیاد بن سکتی ہے۔وہ عورت کا دین اور اس کے اخلاق ہیں دنیا میں بے شمار ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ ایک شخص نے کسی عورت کو محض اس کی شکل وصورت کی بناء پر انتخاب کیا۔لیکن کچھ عرصہ گزرنے پر جب اس کے حسن و جمال میں تنزل کے آثار پیدا ہو گئے کیونکہ جسمانی حسن ایک فانی چیز ہے یا اس کی نسبت کسی زیادہ حسین عورت کو دیکھنے کی وجہ سے بے اصول خاوند کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ گئی۔یا بیوی کے ساتھ شب وروز کا واسطہ پڑنے کے نتیجہ میں اس کی عادات کے بعض ناگوار پہلو خاوند کی آنکھوں کے سامنے آ گئے تو ایسی صورت میں زندگی کی خوشی تو درکنار خاوند کے لئے اس کا گھر حقیقتہً ایک دوزخ بن جاتا ہے اور یہی حال حسب ونسب اور دولت کا ہے کیونکہ

حسب ونسب کی وجہ سے تو بسا اوقات بیوی کے دل میں خاوند کے مقابلہ میں بڑائی اور تفاخر کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو خانگی خوشی کے لئے مہلک ہے اور دولت ایک آنی جانی چیز ہے جو آج ہے اور کل کو ختم ہو سکتی ہے اور پھر بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بیوی کی دولت خاوند کے لئے مصیبت ہو جاتی ہے اور راحت کا سامان نہیں بنتی۔ پس جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے گھریلو اتحاد اور گھریلو خوشی کی حقیقی بنیاد عورت کے دین اور اس کے اخلاق پر قائم ہوتی ہے اور بڑا ہی بدقسمت ہے وہ انسان جو ٹھوس اور صاف کو چھوڑ کر وقتی کھلونوں یا طمع سازی کی چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔

پھر ایک نیک اور خوش اخلاق بیوی کا جو گہرا اثر اولاد پر پڑتا ہے وہ تو ایک ایسی دائمی نعمت ہے جس کی طرف سے کوئی دانا شخص جسے اپنی ذاتی راحت کے علاوہ نسلی ترقی کا بھی احساس ہو آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ بچپن میں اولاد کی اصل تربیت ماں کے سپرد ہوتی ہے کیونکہ ایک تو بچپن میں بچہ کو طبعاً ماں کی طرف زیادہ رغبت ہوتی ہے اور وہ اسی سے زیادہ بے تکلف ہوتا ہے اور اس کے پاس اپنا زیادہ وقت گزارتا ہے اور دوسرے باپ اپنے دیگر فرائض کی وجہ سے اولاد کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں دے سکتا۔ پس اولاد کی ابتدائی تربیت کی بڑی ذمہ داری بہرحال ماں پر پڑتی ہے۔ لہٰذا اگر ماں نیک اور با اخلاق ہو تو وہ اپنے بچوں کے اخلاق کو شروع سے ہی اچھی بنیاد پر قائم کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے مقابل پر ایک ایسی عورت جو دین اور اخلاق کے زیور سے عاری ہے وہ کبھی بھی بچوں میں نیک اخلاق اور نیک عادات پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ایسی عورت بسا اوقات دین کی اہمیت اور نیک اخلاق کی ضرورت کو سمجھتی ہی نہیں۔ پس نہ صرف خانگی خوشی کے لحاظ

سے بلکہ آئندہ نسل کی حفاظت اور ترقی کے لحاظ سے بھی نیک اور با اخلاق بیوی ایک ایسی عظیم الشان نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی اور نعمت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اسی لئے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم دوسری جگہ فرماتے ہیں - خیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ ''یعنی نیک بیوی دنیا کی بہترین نعمت ہے''

مگر حدیث زیر نظر کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بیوی کے انتخاب میں دوسری تمام باتوں کو بالکل ہی نظرانداز کر دینا چاہئے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ نیکی اور اخلاق کے پہلو کو مقدم رکھنا چاہئے ۔ ورنہ بعض دوسرے موقعوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دوسری باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ وہ بھی ایک حد تک انسانی فطرت کے تقاضے ہیں۔ مثلاً پردہ کے احکام کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ لیا کرو تا کہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں شکل وصورت کی وجہ سے تمہارے دل میں انقباض پیدا ہو اور ایک دوسرے موقعہ پر جب ایک عورت اپنی شادی کے متعلق آپ سے مشورہ لینے کی غرض سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا میں تمہیں فلاں شخص سے شادی کا مشورہ نہیں دیتا کیونکہ وہ مفلس اور تنگ دست ہے اور تمہارے اخراجات برداشت نہیں کر سکے گا اور نہ میں فلاں شخص کے متعلق مشورہ دے سکتا ہوں کیونکہ اس کے ہاتھ کا ڈنڈا ہر وقت ہی اٹھا رہتا ہے۔ ہاں فلاں شخص کے ساتھ شادی کرلو وہ تمہارے مناسب حال ہے اور ایک تیسرے موقعہ پر آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ قبیلہ قریش کی عورتیں خاوند کی وفاداری اور اولاد پر شفقت کے حق میں اچھی ہوتی ہیں اور ایک چوتھے موقعہ پر آپؐ نے فرمایا کہ حتّی الوسع زیادہ اولاد پیدا کرنے والی عورتوں کے

ساتھ شادی کروتا کہ میں قیامت کے دن اپنی امّت کی کثرت پر فخر کرسکوں۔ الغرض آپؐ نے اپنے اپنے موقعہ پر اور اپنی اپنی حدود کے اندر بعض دوسری باتوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ لیکن جس بات پر آپؐ نے خاص زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ ترجیح بہرحال دین اور اخلاق کے پہلو کو ہونی چاہئے۔ ورنہ تم اپنے ہاتھوں کو خاک آلود کرنے کے خود ذمہ دار ہوگے۔ یہ وہ زریں تعلیم ہے جس پر عمل کر کے مسلمانوں کے گھر برکت وراحت کا گہوارہ بن سکتے ہیں۔ کاش وہ اسے سمجھیں!۔

﴿ 17 ﴾

بہتر انسان وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کرے

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ (ترمذی)

ترجمہ: جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ سلوک کرنے میں بہتر ہے۔ اور میں اپنے اہل کے ساتھ سلوک کرنے میں تم سب سے بہتر ہوں۔

تشریح:۔ اس حدیث میں بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی جو تاکید کی گئی ہے وہ ظاہر وعیاں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیوی کے ساتھ خاوند کے حسن سلوک کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم نے خدا اور اس کے رسول کو تو مان لیا۔ اور ایمان کی نعمت سے بھی متمتع ہو گئے۔ لیکن حقوق العباد کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ تمہارے ان اعمال کو بھی دیکھے گا جو تم خدا کے بندوں کے ساتھ سلوک کرنے میں بجالاتے ہو۔ اور ان اعمال میں بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو اسلام میں بہت نمایاں درجہ حاصل ہے حتیٰ کہ تم میں سے خدا کی نظر میں بہتر انسان وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ سلوک کرنے میں بہتر ہے۔ لیکن چونکہ ہر شخص اپنے

سلوک کو بزعم خود اچھا قرار دے سکتا ہے اس لئے اس امکانی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اچھے سلوک کا معیار تمہارا کوئی خود تراشیدہ قانون نہیں ہوگا بلکہ اس معاملہ میں میرے نمونہ کو دیکھا جائے گا۔ کیونکہ خدا کی دی ہوئی توفیق سے میں اپنے اہل کے ساتھ سلوک کرنے میں تم سب سے بہتر ہوں۔

اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان عورتوں کے ازدواجی حقوق کو اتنے اعلیٰ معیار پر قائم فرما دیا ہے کہ وقتی رنجشوں کو چھوڑ کر جو بعض اوقات اچھے سے اچھے گھر میں بھی ہو جاتی ہیں۔کوئی شریف بیوی کسی نیک مسلمان کے گھر میں دکھ کی زندگی میں مبتلا نہیں ہوسکتی۔اور حق یہ ہے کہ اگر عورت کو خاوند کی طرف سے سکھ حاصل ہو تو وہ دنیا کی ہر دوسری تکلیف کو خوشی کے ساتھ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور اس سکھ کے مقابلہ میں کسی شریف عورت کے نزدیک دنیا کی کوئی اور نعمت کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔لیکن اگر ایک عورت کے ساتھ اس کے خاوند کا سلوک اچھا نہیں تو خاوند کی دولت بھی اس کے لئے لعنت ہے اور خاوند کی عزت بھی اس کے لئے لعنت ہے اور خاوند کی صحت بھی اس کے لئے لعنت ہے کیونکہ ان چیزوں کی قدر صرف خاوند کی محبت اور گھر کی سکینت کے میدان میں ہی پیدا ہوتی ہے۔پس اس بات میں ذرہ بھر بھی شک کی گنجائش نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد گھروں کی چار دیواری کو جنت بنا دینے کے لئے کافی ہے۔بشرطیکہ عورت بھی خاوند کی فرمانبردار اس کی محبت کی قدردان ہو۔اور پھر خاوند بیوی کے اس اتحاد کا اثر لازماً ان کی اولاد پر بھی پڑتا ہے۔اور اس طرح آج کی

برکت گویا ایک دائمی برکت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

یہ وہ سبق ہے جو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل اس ملک میں اور اس قوم کے درمیان رہتے ہوئے دیا جس میں عورت عموماً ایک جانور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی اور پھر اس حکم کو دو ایسی باتوں کے ساتھ مربوط کر دیا جن کے بلند معیار تک آج کی بظاہر ترقی یافتہ اقوام بھی نہیں پہنچ سکیں اور نہ کبھی پہنچ سکیں گی۔ کیونکہ ان دو باتوں کے ساتھ مل کر عورت کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اس ارفع مقام کو حاصل کر لیتا ہے جس کے اوپر اس میدان میں کوئی اور بلندی نہیں۔ یہ دو باتیں ہمارے آقا کے الفاظ خیر کم خیر کم لاھلہ و انا خیر کم لاھلی کے مطابق یہ ہیں کہ:۔

(اوّل) عورت کے ساتھ خاوند کا حسن سلوک صرف ضروری ہی نہیں ہے بلکہ دراصل حقوق العباد کے میدان میں مرد کا یہی وصف خدا کی نظر میں مرد کے درجہ اور مقام کا حقیقی پیمانہ ہے جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ سلوک میں بہتر ہے وہی خدا کی نظر میں بہتر ہے۔

(دوم) اس حسن سلوک کا معیار کسی شخص کی ذاتی رائے پر مبنی نہیں ہے (کیونکہ اپنے منہ سے تو ہر شخص اپنے آپ کو اچھا کہہ سکتا ہے) بلکہ اس کا معیار رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک اسوہ ہے۔ پس صرف وہی سلوک اچھا سمجھا جائے گا جو اس پاک اسوہ کے مطابق ٹھیک اترے گا۔

﴿ 18 ﴾

دیندار عورت وہ ہے جو اپنے خاوند کا حق ادا کرتی ہے

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَا تُؤَدِّی الْمَرْأَةُ حَقَّ رَبِّهَا حَتّٰی تُؤَدِّیَ حَقَّ زَوْجِهَا

(ابن ماجہ)

ترجمہ: عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے کہ کوئی عورت اس وقت تک خدا تعالیٰ کا حق ادا کرنے والی نہیں سمجھی جاسکتی جب تک کہ وہ اپنے خاوند کا حق ادا نہیں کرتی۔

تشریح: جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف خاوند کو بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے وہاں دوسری طرف بیوی کو خاوند کے حقوق ادا کرنے کی بھی زبردست تلقین فرمائی ہے کیونکہ گھر کی حقیقی سکینت اور حقیقی برکت صرف اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے کہ خاوند بیوی کے ساتھ بہترین سلوک کرنے والا ہو اور بیوی خاوند کے حقوق پوری پوری وفاداری کے ساتھ ادا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عورت کے اس مقدس فریضہ کا اتنا خیال تھا کہ ایک دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ جس مسلمان عورت کا خاوند ایسی حالت میں فوت ہوتا ہے کہ وہ اپنی

بیوی پر خوش ہے تو ایسی عورت خدا کے فضل سے جنّت میں جائے گی۔ اور اوپر والی حدیث کے دوسرے حصہ میں فرماتے ہیں کہ اگر اسلام میں اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں حکم دیتا کہ عورت اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

اور یہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو عورت اپنے خاوند کا حق ادا نہیں کرتی وہ خدا کا حق بھی ادا نہیں کرسکتی اس میں دو گہری حکمتیں ہیں اوّل یہ کہ خواہ درجہ کا کتنا ہی فرق ہو یہ دونوں حقوق دراصل ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً جس طرح خدا اپنے بندوں سے انتہائی محبت کرنے والا ہے اسی طرح خاوند کو بھی اپنی بیوی کے متعلق غیر معمولی محبت کا مقام حاصل ہوتا ہے اور جس طرح باوجود اس محبت کے خدا اپنے بندوں کا حاکم اور نگران ہے اسی طرح خاوند بھی بیوی کی محبت کے باوجود گھر کا نگران اور قوّام ہوتا ہے۔ پھر جس طرح خدا اپنے بندوں کا رازق ہے اور ان کی روزی کا سامان مہیا کرتا ہے اسی طرح خاوند بھی اپنی بیوی کے اخراجات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے اور اسی طرح اور بھی کئی پہلو مشابہت کے ہیں۔ اور یہ مشابہت اتنی نمایاں ہے کہ ہماری زبان میں تو خاوند کو مجازی خدا کا نام دیا گیا ہے۔ اور لفظاً بھی خداوند اور خاوند ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ دوسری حکمت اس میں یہ ہے کہ اسلام میں بندوں کے حقوق بھی خدا ہی کی طرف سے مقرر شدہ ہیں۔ اور شریعت نے حقوق العباد کو انتہائی اہمیت دی ہے حتّٰی کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ خدا اپنے حقوق سے تعلق رکھنے والے گناہ تو معاف کر دیتا ہے۔ مگر بندوں کے حقوق سے تعلق رکھنے والے گناہ اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک کہ خود بندے معاف نہ کریں۔ انہی دو حکمتوں کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اور خدا کی

قسم کھا کر بڑے زوردار الفاظ میں فرماتے ہیں کہ کوئی عورت اس وقت تک خدا کے حقوق ادا کرنے والی نہیں سمجھی جاسکتی جب تک کہ وہ اپنے خاوند کے حقوق ادا نہ کرے۔ اور پھر ان الفاظ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس عورت پر خدا راضی نہیں ہوتا جو اپنے خاوند کے حقوق ادا نہیں کرتی۔

باقی رہا یہ سوال کہ بیوی پر خاوند کا حق کیا ہے سو اس کے متعلق قرآن شریف اور حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ بیوی پر خاوند کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی فرمانبردار ہو۔ اس کا واجبی ادب ملحوظ رکھے۔ اس سے محبت کرے۔ اس کی وفادار رہے۔ اس کی اولاد کی تربیت کا خیال رکھے۔ اس کے مال کی حفاظت کرے اور جہاں تک ممکن ہو اس کی خدمت بجالائے اس کے مقابل پر خاوند پر بیوی کا حق یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ محبت اور شفقت اور دلداری سے پیش آئے۔ اس کے آرام کا خیال رکھے۔ اس کے جذبات کا احترام کرے اور اپنی حیثیت کے مطابق اس کے ضروری اخراجات کا کفیل ہو۔ اب ہر شخص خود سوچ سکتا ہے کہ اگر مرد اور عورت ایک دوسرے کے متعلق ان حقوق کا خیال رکھیں تو مسلمانوں کے گھروں کے جنّت بننے میں کیا کسر رہ جاتی ہے؟

﴿ 19 ﴾

یتیموں کی پرورش کرنے والا انسان جنّت میں رسول پاکؐ کے ساتھ ہوگا

عَنۡ سَھۡلِ بۡنِ سَعۡدٍ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَ كَافِلُ الۡيَتِيۡمِ فِي الۡجَنَّةِ كَهَاتَيۡنِ (ترمذی)

ترجمہ: سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں اور یتیم کی پرورش اور حفاظت کرنے والا مسلمان جنّت میں اس طرح ہوں گے جس طرح کہ میری یہ دو انگلیاں ہیں اور یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں اُٹھا کر باہم پیوست کردیں۔

تشریح: یتیم بچے قوم کا ایک نہایت قیمتی خزانہ ہوتے ہیں۔اور اسلام نے یتیموں کی پرورش اور حفاظت کے متعلق انتہائی تاکید کی ہے چنانچہ اس حدیث کے الفاظ اس غیر معمولی تاکید کے علَم بردار ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یتیم کی حفاظت کرنے والے مسلمان کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ جنّت میں میرے اس قدر قریب ہوگا جس طرح ایک ہاتھ کی دو انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہوتی

ہیں۔اس تاکیدی حکم کے بعد جس کے ساتھ ایک غیر معمولی انعام بھی وابستہ ہے کوئی سچا مسلمان یتیموں کی پرورش اور حفاظت کی طرف سے غافل نہیں ہوسکتا۔یتیموں کی نگہداشت میں صرف بے بس اور بے سہارا بچوں کی حفاظت اور تربیت کا پہلو ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس ذریعہ سے قوم کے افراد میں قربانی کی روح بھی ترقی کرتی ہے۔جس قوم کے افراد اس بات کا یقین رکھتے ہوں کہ اگر وہ قومی خدمت بجالاتے ہوئے فوت ہو گئے تو ان کے پیچھے ان کی یتیم اولاد بے بس اور بے سہارا نہیں رہ جائے گی بلکہ ان کے رشتہ دار اور قوم کے دوسرے افراد ان کے یتیم بچوں کے پوری طرح کفیل ہوں گے۔تو وہ لازماً ہر قربانی کے لئے جرأت کے ساتھ قدم اٹھائیں گے۔اور اس طرح قوم کے افراد میں قومی خدمت اور قربانی کی روح ترقی کرے گی۔پس یتیموں کی حفاظت کا انتظام صرف نابالغ بچوں کو روحانی اور اخلاقی اور مالی تباہی سے بچانے کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ قوم کی مجموعی ترقی اور قوم میں قربانی کی روح کو فروغ دینے کا بھی بھاری ذریعہ ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں میں اس مقدس فریضہ کی طرف سے سخت غفلت برتی جاتی ہے بسا اوقات قریبی رشتہ دار یتیموں کے محافظ بننے کی بجائے ان کے اموال کو لوٹنے اور انہیں غفلت کی حالت میں چھوڑ کر تعلیمی اور تربیتی لحاظ سے تباہ کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔اور جو یتیم خانے مختلف اداروں کی طرف سے قائم ہیں ان میں عموماً یتیموں کے جذباتِ خودداری اور عزّت نفس کو بری طرح کچلا جاتا ہے اور یتیم بچّے عملاً بھک منگے فقیر بن کر رہ جاتے ہیں۔پس اس معاملہ میں بڑی اصلاح کی ضرورت ہے جو رشتہ دار اپنے عزیز یتیموں کے ولی قرار پائیں ان کا فرض

ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت اوران کے کیریکٹر کی بلندی اوران کے اموال کی حفاظت کا پورا پورا اہتمام کریں۔اور جو ادارے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں ان کے کارکنوں کا فرض ہے کہ یتیم بچوں کے لئے باپ کی طرح بن کر رہیں۔اورانہیں دردر کے سوالی بنانے کی بجائے قوم کے خوددار اور مفید ممبر بنانے کی تدبیر اختیار کریں اورسب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے دلوں میں یہ احساس نہ پیدا ہونے دیں کہ ہم گویا بے بس اور بے کس ہوکر دوسروں کی خیرات پر پڑے ہیں۔

دوسری طرف یتیم بچوں کے لئے بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔انہیں یہ بات ہمیشہ یادرکھنی چاہئے کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان سید الکونین فخر الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک یتیم تھا۔اوریتیم بھی وہ جس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔اوراس کی ماں بھی اسے چھ سات سالہ بچہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔پس اگر وہ نیکی کا راستہ اختیار کریں گے تو یقیناً خدا انہیں بھی ہرگز ضائع نہیں کرے گا اور خدا سے بڑھ کر کس کی کفالت ہوسکتی ہے!

﴿ 20 ﴾

ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی انتہائی تاکید

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَازَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ

(بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جبریل نے مجھے ہمسایہ کے متعلق خدا کی طرف سے بار بار اتنی تاکید کی ہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید اسے وارث ہی قرار دے دے گا۔

تشریح: ہمسائے بھی انسانی سوسائٹی کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایوں کے ساتھ نیک سلوک کی سخت تاکید فرمائی ہے حق یہ ہے کہ جو شخص اپنے ہمسایہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا وہ دراصل انسان کہلانے کا حقدار ہی نہیں۔کیونکہ انسان ایک متمدن مخلوق ہے اور ہمسائیگت تمدن کا ایک لازمی اور ضروری حصہ ہے پس باہمی تعلقات کی بہتری اور مضبوطی کے لئے اسلام حکم دیتا ہے کہ ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور اس حکم میں اس قدر تاکید کا پہلو اختیار کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جبریل نے مجھے اس

بارے میں اس طرح تکرار اور تاکید کے ساتھ کہا کہ میں نے خیال کیا کہ شاید ہمسایہ کو وارث ہی بنا دیا جائے گا۔ اس تاکیدی حکم کے پیشِ نظر ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ خاص محبت اور احسان کا سلوک کرے اور ان کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو اور ان کی غیر حاضری میں ان کے بیوی بچوں کا خیال رکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا اتنا خیال تھا کہ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اس کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں کہ جب تم گھر میں گوشت وغیرہ پکاؤ تو شوربہ زیادہ کر دیا کرو تا تمہارا کھانا حسبِ ضرورت تمہارے ہمسایہ کے کام بھی آسکے۔

دراصل انسان کے اخلاق کا اصل معیار اس کا وہ سلوک ہے جو وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ کرتا ہے۔ دور کے لوگوں اور کبھی کبھار ملنے والوں کے ساتھ تو انسان تکلف کے رنگ میں وقتی اخلاق کا اظہار کر دیتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے ساتھ اس کا دن رات کا واسطہ پڑتا ہے۔ ان کے ساتھ تکلف نہیں چل سکتا۔ اور انسان کے اخلاق بہت جلد اپنی اصل صورت میں عریاں ہو کر لوگوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد جو اس حدیث میں درج ہے ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کے علاوہ بالواسطہ طور پر خود سلوک کرنے والوں کے اپنے اخلاق کی درستی کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے کیونکہ ہمسایوں کے ساتھ وہی شخص اچھا سلوک کر سکتا ہے جس کے اپنے اخلاق حقیقۃً اچھے ہوں۔ کیونکہ ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے لئے ایک شخص کو لازماً خود بھی اچھا بننا پڑے گا۔ ورنہ شب و روز ملنے والوں کے ساتھ تکلف کا پیراہن زیادہ دیر تک چاک

ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

اسی طرح اس حدیث کے وسیع معنوں کے مطابق قوموں اور ملکوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ حتی الوسع اپنی ہمسایہ قوموں اور ملکوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔اور ان کے ساتھ احسان اور تعاون کا معاملہ کریں۔کیونکہ جس طرح ایک فرد اخلاق کے قانون کے ماتحت ہے۔اسی طرح قومیں بھی اس قانون کے ماتحت ہیں۔اور حق یہ ہے کہ دنیا میں امن تبھی قائم ہوسکتا ہے کہ جب قومیں اور حکومتیں بھی اپنے آپ کو اخلاق کے قانون کا کاربند سمجھیں۔

﴿ 21 ﴾

جنگ کی تمنّا نہ کرو لیکن اگر لڑائی ہو جائے تو ڈٹ کر مقابلہ کرو

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یٰاَیُّھَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ وَاسْأَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ وَاِذَا لَقِیْتُمُوْ ھُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّۃَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ (مسلم)

ترجمہ: عبداللہ بن ابی اوفٰی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا اے مسلمانو! دشمن کے مقابلہ کی کبھی تمنا نہ کیا کرو۔ اور خدا سے امن اور عافیت کے خواہاں رہو۔ لیکن جب دشمن کے ساتھ تمہارا ٹکراؤ ہو جائے تو پھر صبر اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کرو اور یاد رکھو کہ جنّت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔

تشریح: یہ حدیث دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور فلسفۂ جہاد کے متعلق اسلام کا نہایت لطیف خلاصہ پیش کرتی ہے جو چار اصولی باتوں میں آجاتا ہے:

(۱) دشمن کے ساتھ لڑنے کی کبھی خواہش نہ کرو اور نہ اس پر حملہ کرنے میں اپنی طرف سے پہل کرو۔

(۲) ہمیشہ خدا سے امن اور عافیت کے خواہاں رہو۔

(۳) اگر دشمن کی طرف سے پہل ہونے پر اس کے ساتھ لڑائی کی صورت پیدا ہو جائے تو پھر کامل صبر اور استقلال کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو۔

(۴) مقابلہ کی صورت میں تسلّی رکھو کہ دو انعاموں میں سے ایک انعام بہرحال تم کو مل کر رہے گا۔ یعنی یا تو تم فتح پاؤ گے اور یا شہادت حاصل کرو گے۔

جنگوں کے متعلق خواہ وہ دینی ہوں یا دُنیوی، دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی ملک اور تاریخِ عالم کا کوئی زمانہ اس سے بہتر ضابطۂ اخلاق پیش نہیں کر سکتا اور ضمناً اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام دین کے معاملہ میں جبر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ اگر لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی اجازت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی یہ ارشاد نہ فرماتے کہ تم دشمن کے مقابلہ کی خواہش نہ کرو۔ جبر کرنے والا تو خود موقع تلاش کر کر کے دوسروں پر حملہ آور ہوتا ہے۔ تا کہ انہیں مغلوب کر کے اپنے رنگ میں ڈھال لے۔ پس آپؐ کا یہ فرمانا کہ کبھی دشمن کے مقابلہ کی خواہش نہ کرو۔ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اسلام دین کے معاملہ میں قطعاً جبر کی اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ وہی تعلیم ہے جو قرآن شریف نے ان الفاظ میں صراحتہً بیان فرمائی ہے کہ لا اکراہ فی الدین "یعنی دین کے معاملہ میں جبر کرنا ہرگز جائز نہیں"۔

پھر ایک طرف مسلمانوں کو پہل کرنے سے روکنا اور دوسری طرف انہیں صبر کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تلقین کرنا اس لطیف حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ گو اسلام مسلمانوں کو ظالم بننے سے بہرحال روکتا ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کے دلوں میں سے موت کا خوف بھی قطعی طور پر نکالنا چاہتا ہے۔ اور یہی وہ وسطی تعلیم ہے۔ جو قوموں کی ترقی کی بنیاد بنا کرتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے نفسوں کو روک کر رکھیں اور کسی صورت میں بھی ظالم نہ بنیں۔ اور دوسری طرف وہ موت کے سامنے ایسے بہادر اور بے خطر ہوں کہ تلواروں کے سایہ میں جنّت کا نظارہ دیکھیں۔

﴿ 22 ﴾

دشمن سے بدعہدی نہ کرو اور بچوں اور عورتوں کے قتل سے بچو

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَّرَ اَمِيْرًا عَلٰى جَيْشٍ اَوْسَرِيَّةٍ قَالَ اغْزُوْا بِسْمِ اللهِ ....وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا....وَلَا امْرَأَةً[1]۔

(مسلم)

ترجمہ: بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی کوئی پارٹی جہاد کے لئے روانہ فرماتے تو اس کے امیر کو نصیحت فرماتے تھے کہ اللہ کا نام لے کر خدا کے رستہ میں نکلو اور کبھی خیانت نہ کرو۔ اور نہ کبھی دشمن سے بدعہدی کرو اور نہ قدیم وحشیانہ طریق کے مطابق دشمن کے مقتولوں کے اعضاء وغیرہ کاٹو اور نہ کسی بچے یا عورت کو قتل کرو۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد ابتدائی جنگوں میں صحابہ اور ان کے بعد آنے والے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اسلام نے کفّار کے مظالم اور اُن کی جارحانہ کارروائیوں سے مجبور ہو کر تلوار اٹھائی۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں نے ظالم دشمن کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق کا وہ نمونہ دکھایا۔ جس کی

---

[1] وَلَا امْرَأَةً کے الفاظ موطا امام مالک سے لئے گئے ہیں۔ منہ

نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے عربوں میں عورتوں اور بچوں تک کو قتل کر دینے کا طریق عام تھا۔ بلکہ یہ طریق موسوی شریعت کے قیام سے دنیا کے معتد بہ حصہ میں وسیع ہو چکا تھا۔ اور اس کے علاوہ عربوں میں یہ بھی رواج تھا کہ مفتوح دشمن کے مقتولوں کے ناک کان وغیرہ کاٹ کر اپنی وحشیانہ خوشی کو کمال تک پہنچاتے تھے۔ اس قبیح رسم کو عرب لوگ مثلہ کرنا کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب ظالمانہ طریقوں کو سختی کے ساتھ روک کر حربی دشمن کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دی اور خیانت اور غدّاری اور بدعہدی کو قطعی حرام قرار دے کر دنیا میں ایک اعلیٰ ضابطہ اخلاق کی بنیاد قائم کی۔

اس کے علاوہ جیسا کہ دوسری احادیث سے ثابت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی حکم دیا کہ حربی دشمن کے بوڑھے لوگوں اور مذہبی خدمت کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے والوں کے خلاف خواہ وہ کسی مذہب وملت کے ہوں، ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اور جیسا کہ قرآن شریف سورہ محمد میں فرماتا ہے۔ جنگی قیدیوں کے متعلق بھی حکم دیا ہے کہ انہیں قتل نہ کیا جائے بلکہ یا تو انہیں بطور احسان چھوڑ دیا جائے اور یا واجبی فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے بہرحال جنگ کے اختتام کے بعد ان کی قید کو لمبا نہ کیا جائے اور دورانِ قید میں بھی جنگی قیدیوں کے ساتھ اسلام نے حسنِ سلوک کا اس تاکید کے ساتھ حکم دیا کہ خود غیر مسلم قیدیوں کی روایت ہے کہ مسلمان ہمیں اچھا کھانا دیتے تھے اور خود معمولی خوراک پر گزارہ کرتے تھے۔ ہمیں اونٹوں پر سوار کراتے تھے اور خود پیدل چلتے تھے۔ کیا کسی حربی دشمن کے ساتھ دنیا کی کسی قوم نے تاریخ کے کسی زمانہ میں اس سے بہتر سلوک کیا ہے؟

باقی رہا دشمن کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ سو اس کے متعلق قرآن شریف فرماتا ہے:

لا یجر منکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ۔

''یعنی اے مسلمانو! کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہرگز اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے متعلق عدل و انصاف کے رستہ سے ہٹ جاؤ۔ بلکہ تمہیں چاہئے کہ ہر حال میں دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا سلوک کرو کہ یہی تقویٰ کا تقاضا ہے''۔

مگر افسوس کہ دنیا نے اس شاندار تعلیم کی قدر نہیں کی۔

﴿23﴾

سات تباہ کرنے والی چیزیں

(قتلِ ناحق۔سودخوری۔بہتان تراشی وغیرہ)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اجْتَنِبُوْا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ وَمَا هُنَّ قَالَ الشِّرْكُ بِاللهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلُ الرِّبَا وَاَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ وَالتَّوَلِّیْ يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ

(بخاری)

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اے مسلمانو! تمہیں سات تباہ کرنے والی باتوں سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہئے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ سات باتیں کون سی ہیں؟ آپ نے فرمایا (۱) کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا (۲) نظر فریب باتوں کے پیچھے لگنا (۳) کسی انسان کو ناحق قتل کرنا (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال غصب کرنا (۶) جنگ میں دشمن کے سامنے پیٹھ دکھانا اور (۷) بے گناہ مومن عورتوں پر بہتان باندھنا''

تشریح: اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات ایسی باتیں بیان فرمائی ہیں جو بالآخر افراد اور قوموں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ سب سے پہلی اور سب سے زیادہ اہم بات شرک ہے جس کے معنی خدا کی ذات و صفات میں کسی دوسرے کو شریک قرار دینا ہے۔ شرک ایمانیات کے میدان میں جُرم نمبرا کا حکم رکھتا ہے۔ اور بالواسطہ طور پر شرک کے نتیجہ میں اخلاق پر بھی بھاری اثر پڑتا ہے۔ شِرک دو قسم کا ہے ایک شرک ظاہر ہے اور دوسرے شرکِ خفی شرک ظاہر تو یہ ہے کہ کسی انسان یا کسی دوسری چیز کو خدا کے برابر یا خدائی حکومت میں حصہ دار یا خدائی صفات کا مالک قرار دیا جائے۔ جیسا کہ مثلاً ہندو خدا کے علاوہ بہت سے دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور انہیں خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جیسا کہ عیسائی حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور اس کی صفات اور حکومت میں حصہ دار یقین کرتے ہیں۔ اور شرک خفی یہ ہے کہ بظاہر تو خدا کا کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے اور خدا کی توحید کا مدعی بنا جائے مگر عملاً کسی دوسری چیز کی ایسی عزّت کی جائے جو صرف خدا کی کرنی چاہئے۔ یا کسی دوسری چیز پر ایسا بھروسہ کیا جائے جو صرف خدا کے شایانِ شان ہے یا کسی دوسری چیز کے ساتھ ایسی محبت کی جائے جو صرف خدا کے ساتھ ہونی چاہئے یا کسی دوسری چیز سے ایسا ڈرا جائے جو صرف خدا کا حق ہے اس قسم کا مخفی شرک بدقسمتی سے آج کل بہت سے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اسلام ان دونوں قسم کے شرکوں یعنی شرک ظاہر اور شرک خفی سے بچنے کا حکم دیتا ہے اور ایک دوسری حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شرک کے اجتناب یعنی توحید کے مفہوم میں خدا پر ایمان لانے کے علاوہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔ کیونکہ رسالت ہی کے ذریعہ دنیا

میں حقیقی توحید قائم ہوتی ہے۔ بہرحال اسلام میں شرک کے خلاف انتہائی تاکید پائی جاتی ہے اور ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ شرک ظاہر اور شرک خفی دونوں سے بچ کر رہے۔ شرک خفی کے متعلق حضرت مسیح موعودؑ بانی سلسلہ احمدیہ کس لطیف انداز میں فرماتے ہیں کہ:

ہر چہ غیر خدا بخاطر تست   آں بتِ تست اے بایماں سست
پُر حذر باش زیں بتانِ نہاں   دامن دل زوست شان برہاں

''یعنی ہر وہ چیز جو تیرے دل میں خدا کے مقابل پر جاگزیں ہے وہ تیرا بُت ہے اے سست ایمان والے شخص! تجھے چاہئے کہ ان مخفی بتوں کی طرف سے ہوشیار رہے اور اپنے دل کے دامن کو ان بتوں سے بچا کر رکھ''۔

دوسری بات اس حدیث میں سحر بیان کی گئی ہے سحر کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جو نظر فریب ہو یعنی جس میں ایک چیز کی اصل حقیقت پر پردہ ڈال کر اُسے دوسری شکل میں پیش کر دیا جائے۔ اور جھوٹ کو سچ بنا کر دکھایا جائے۔ اس قسم کا سحر جھوٹ کی ایک بدترین قسم ہے کیونکہ اس میں جھوٹ کے ساتھ دھوکے اور چالاکی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے اسی لئے عربی میں ملمع سازی کو بھی سحر کہتے ہیں۔ مثلاً جب ایک چاندی کی چیز پر سونے کا پانی پھیر کر اسے سونے کے طور پر پیش کیا جائے۔ تو اسے عربی میں سحر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی میں اس چیز کو

بھی سحر کہتے ہیں جس میں فریب کے طریق پر اخفاء اور رازداری کا رنگ اختیار کیا جائے۔ اسلام ان سب باتوں کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اخلاق پر نہایت بُرا اثر ڈالنے والی۔ عادات کو پیچیدہ بنانے والی اور آپس میں بدگمانی اور تفرقہ اور انشقاق پیدا کرنے والی ہیں اور عرف عام والے سحر کی ملمع سازی اور دھوکا دہی تو ظاہر و عیاں ہے جس کے متعلق کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں سحر کے معنی فتنہ و فساد کے بھی ہیں اور اس صورت میں بھی سحر کی خرابی ایک بدیہی امر ہے اور اگلے فقرہ میں قتل کا ذکر اس مفہوم پر ایک عمدہ قرینہ ہے۔

تیسری بات قتلِ ناحق بیان کی گئی ہے۔ اسلام نے قتل کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔ اور قتلِ عمد کی سزا موت مقرر کی گئی ہے جسے سوائے ایسی صورت کے بدلا نہیں جاسکتا کہ جب فریقین اصلاح کے خیال سے موت کی سزا کو دیت یعنی خون بہا کی صورت میں بدلنے پر رضامند ہو جائیں اور حاکمِ وقت بھی اسے منظور کر لے۔ اور یہ رعایت اس حکمت کے ماتحت رکھی گئی ہے کہ تا اگر فریقین کے خاندانوں میں اصلاح کی حقیقی امید موجود ہو تو بلاوجہ قتل کی سزا پر زور دے کر دو خاندانوں کو انتقام در انتقام کے چکر میں نہ ڈالا جائے۔

اور قتل کے ساتھ ''ناحق'' کی شرط اس لئے رکھی گئی ہے کہ تا جنگ میں قتل ہونے والوں یا حکومت کے قانون کے ماتحت قتل کی باضابطہ سزا پانے والوں کی استثناء قائم رہے۔ قتلِ ناحق میں ایسے قتل بھی شامل ہیں جو بعض مغلوب الغضب افراد یا مذہبی دیوانے کسی شخص کو بزعمِ خود قتل کی سزا کا مستحق سمجھ کر اسے باضابطہ عدالت میں لے جانے کے بغیر خود بخود قتل کر دیتے ہیں۔ اسلام اس قسم کی دست درازی اور

قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے طریق کو بھی بڑی سختی کے ساتھ روکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے حکم کے بغیر بھی ملک کا امن قائم نہیں رہ سکتا درحقیقت قتلِ ناحق کے جرم کو اسلام نے انتہاء درجہ خطرناک قرار دیا ہے۔ حتّٰی کہ ایک جگہ قرآن شریف فرماتا ہے کہ جس شخص نے ایک جان کو ناحق قتل کیا۔ اس نے گویا سارے جہاں کو قتل کیا۔ کیونکہ ناحق قتل کے نتیجہ میں نہ صرف انتقام در انتقام کا لمبا تسلسل اور گندہ دور قائم ہو جاتا ہے۔ بلکہ ملک میں قانون کا احترام بھی بالکل مٹ جاتا ہے اور اس قسم کے واقعات کے نتیجہ میں انسانی ضمیر دہشت زدہ ہو کر آہستہ آہستہ بالکل مر جاتا ہے۔ پس ضروری تھا کہ قتل کو انتہاء درجہ کے جرموں میں شمار کیا جائے۔

چوتھی بات اس حدیث میں سود بیان کی گئی ہے بیشک صدیوں کے غیر اسلامی ماحول کی وجہ سے آج کل سود قریباً ساری دنیا کے اقتصادی نظاموں کا جز و لاینفک قرار پا چکا ہے اور خود مسلمانوں کا ایک معتد بہ حصہ بھی اس میں بالواسطہ یا بلا واسطہ ملوّث ہے۔ مگر اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ سود ایک بھاری لعنت ہے جو نہ صرف انسانی ہمدردی اور موالات کے جذبات کے لئے تباہ کن ہے۔ بلکہ دنیا میں جھگڑوں اور لڑائیوں کی آگ کو بھڑکانے کا بھی بہت بڑا موجب ہے ۔سود کے نتیجہ میں (۱) انسانی فطرت کے لطیف اخلاق تباہ ہوتے ہیں۔ (۲) اپنی طاقت سے زیادہ قرض برداشت کرنے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور (۳) لڑائیوں اور جنگوں کو ناواجب طول حاصل ہوتا ہے کیونکہ دشمنی کے جوش میں اندھے ہو کر لوگ بے تحاشہ قرض لیتے اور لڑائی کی آگ کو بپا کرتے چلے جاتے ہیں ۔اس لئے اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر قرضہ کے لین دین کو ذیل کی تین صورتوں میں محدود کر دیا

اوّل:۔سادہ قرضہ جسے عرفِ عام میں قرضہ حسنہ کہتے ہیں۔جس طرح ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کو یا ایک دوست دوسرے دوست کو یا ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ کو ضرورت کے وقت قرضہ دیتا ہے (دوسرے) قرضہ بصورت رہن یعنی اپنی کوئی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ رہن رکھ کر اس کی ضمانت پر کچھ رقم قرض لے لی جائے اور (تیسرے) تجارتی شرکت یعنی کسی شخص کو اپنا روپیہ تجارت یا صنعت وحرفت کی صورت دے کر اس کے ساتھ نفع ونقصان میں شرکت کا فیصلہ کر لیا جائے۔ان تین صورتوں کے سوا اسلام کسی اور قرض کی اجازت نہیں دیتا اور سود کے لینے اور دینے کو (خواہ اس کی شرح کم ہو یا زیادہ) حرام اور ممنوع قرار دیتا ہے۔یہ خیال کرنا کہ سود کے بغیر گزارہ نہیں چلتا ایک باطل خیال ہے جو محض آج کل کے باطل ماحول کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ورنہ اسلامی غلبہ کے زمانہ میں دنیا کی وسیع تجارت سود کے بغیر ہی چلتی تھی اور انشاء اللہ آئندہ بھی جب کہ اسلام کے دوسرے غلبہ کا دور آئے گا۔اور لوگ ٹھوکریں کھا کھا کر بیدار ہوں گے پھر اسی طرح چلا کرے گی۔

پانچویں بات یتیم کا مال کھانا بیان کی گئی ہے۔یہ گناہ بھی خاندانوں اور قوموں کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔کیونکہ اس کے نتیجہ میں ایک تو قوم کے نونہال تباہ ہوتے ہیں دوسرے ہمدردی کا جذبہ مٹتا اور بد دیانتی کا جذبہ ترقی کرتا ہے۔تیسرے کمزور جنس پر ظلم کا رستہ کھلتا ہے۔اور چوتھے قوم میں سے قربانی کی روح بھی مٹنی شروع ہو جاتی ہے۔یقیناً اس قوم کے افراد کبھی بھی جرأت کے ساتھ قربانی کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتے جن کی آنکھوں کے سامنے یتیموں کے لٹنے اور برباد ہونے کے نظارے پیش آتے رہیں کیونکہ اس صورت میں طبعاً ان کے اندر یہ ڈر پیدا ہوگا کہ

ہمارے مرنے کے بعد ہمارے یتیم بچوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔پس یتیموں کی ہمدردی اور یتیموں کے مال کی حفاظت اسلام میں ایک نہایت اہم ذمہ داری قرار دی گئی ہے اور قرآن شریف نے اس پر انتہائی زور دیا ہے۔

چھٹی بات لڑائی کے میدان میں دشمن کو پیٹھ دکھانا ہے۔یہ کمزوری بھی قوموں کی تباہی میں بھاری اثر رکھتی ہے۔حق یہ ہے کہ کوئی بزدل قوم زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتی اور بڑی آسانی سے ظالم اور جابر قوموں کی شکار ہو جاتی ہے اس لئے اسلام نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھانے اور بھاگنے کو کبیرہ گناہ میں شمار کیا ہے۔چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ ٥ وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَمَاْوٰہُ جَھَنَّمُ ؕ (سورۃُ الانفال ۱۶۔۱۷) یعنی اے مومنو!جب تم کافروں کے سامنے لڑائی میں صف آراء ہوتو پھر کسی حال میں بھی انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور جو شخص ایسے مقابلہ میں پیٹھ دکھائے گا سوائے اس کے کہ وہ کسی جنگی تدبیر کے طور پر ادھر اُدھر جگہ بدلنے کا طریق اختیار کرے یا مومنوں کی کسی دوسری پارٹی کے ساتھ ملاپ پیدا کر کے دشمن کا مقابلہ کرنا چاہے۔تو وہ خدا کے غضب کو اپنے سر پر لے گا۔اور اس کا ٹھکانا جہنّم کی آگ ہے۔آج کے بظاہر ترقی یافتہ زمانہ میں بھی کوئی آزمودہ کار جرنیل اپنی فوج کو اس سے بہتر ہدایت نہیں دے سکتا۔

ساتویں اور آخری بات اس حدیث میں بے گناہ مومن عورتوں پر بہتان لگانا بیان کی گئی ہے۔اور یہ بات بھی حقیقتہً قومی اخلاق کو سخت صدمہ پہنچانے والی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ بے شمار لوگوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ بہتان والی باتوں کو شوق اور دلچسپی سے سنتے اور پھر انہیں اس طرح ہوا دیتے ہیں کہ وہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی اور معصوم دلوں کو تباہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو بعض لحاظ سے اصل بے حیائی کی نسبت بھی بے حیائی کا چرچا سوسائیٹی کے لئے زیادہ مضر ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں کمزور لوگوں کے دل مسموم ہوتے اور بدی کا رعب مٹتا ہے بے حیائی کا فعل اگر اس کا علم صرف دو انسانوں تک محدود رہے تو باوجود ایک انتہائی گناہ ہونے کے بہرحال اپنے اثرات کے لحاظ سے محدود ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا چرچا لوگوں کی زبانوں پر ہونے لگے تو کئی کمزور نوجوان اس کے گندے اثر سے متأثر ہونے لگتے ہیں۔ اور بدی کا وہ قدرتی رعب جو فطرت انسانی کا حصہ اور بدی کو روکنے کا ایک زبردست آلہ ہے۔ کمزور پڑنا شروع ہو جاتا ہے اس لئے اسلام نے جہاں اصل بدی کو روکا ہے وہاں اس نے بہتان تراشی اور بدی کے چرچے کا رستہ بھی بڑی سختی کے ساتھ بند کیا ہے اور یہی وہ حکمت کی راہ ہے جو قوم میں حقیقی اصلاح کی موجب ہو سکتی ہے۔

پھر اگر اخلاق و اطوار کے مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے اس حدیث پر نظر ڈالی جائے تو اس حدیث کی ایک اور خوبی بھی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں ایمانیات اور اخلاقیات اور قیامِ امن اور اقتصادیات اور کمزوروں کے حقوق کی حفاظت اور قومی بقاء اور بے حیائی کے انسداد کو نہایت لطیف رنگ میں مدّنظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً شرک سے اجتناب کرنے کا ذکر ایمان کی حفاظت کی غرض سے داخل کیا گیا ہے۔ سحر کی حرمت کو کیریکٹر کی بلندی اور عادات کی صفائی کے پیش نظر

شامل کیا گیا ہے۔قتل ناحق کے ذکر کو امنِ عامہ کی غرض سے داخل کیا گیا ہے۔سود کی حرمت کو اقتصادی اصلاح کی بناء پر شامل کیا گیا ہے۔یتیم کی حفاظت کے حکم کو کمزوروں کے ساتھ عدل وانصاف کے قیام کی غرض سے داخل کیا گیا ہے اور بہتان تراشی کی حرمت کو بے حیائی کے سدّ باب کے لئے داخل کیا گیا ہے اس طرح ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے درحقیقت اس زریں ہدایت کے ذریعہ دریا کو کوزے میں بند کر کے محفوظ کر دیا ہے۔

﴿ 24 ﴾

نشہ پیدا کرنے والی چیزوں کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ (ابو داؤد)

ترجمہ: جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرتی ہے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

تشریح: یہ لطیف حدیث جہاں شراب اور ہر دوسری نشہ آور چیز کو حرام قرار دیتی ہے۔ وہاں اس حدیث میں یہ حکیمانہ اصول بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب تک ایک بدی کو اس کی جڑ سے نہ کاٹا جائے اور اس کے تمام امکانی رخنوں کو بند نہ کیا جائے اس کا سدّ باب ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ چونکہ شراب یا دوسری مسکرات کی تھوڑی مقدار نشہ پیدا نہیں کرتی لہٰذا ان کے محدود استعمال میں حرج نہیں ایک خطرناک غلطی ہے۔ انسانی فطرت کچھ اس طرح پر واقعہ ہوئی ہے کہ جب اسے کسی چیز کی اجازت دی جائے تو پھر وہ اس قسم کے باریک فرقوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکتا کہ مجھے فلاں حد سے آگے نہیں جانا چاہئے۔ خصوصًا نشہ پیدا کرنے والی چیزوں میں یہ خطرہ بہت ہی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس میدان میں ایک دفعہ قدم رکھنے کے بعد اکثر انسان آگے بڑھنے سے رک نہیں سکتے۔ اور رتّی سے ماشہ اور ماشہ سے تولہ اور تولہ سے

چھٹانک اور چھٹانک سے سیر کی طرف قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال حکمت سے شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کی تھوڑی مقدار کو بھی حرام قرار دیا ہے۔تاکہ اس قسم کی خطرناک بدیوں کا جڑ سے استیصال کیا جا سکے۔دنیا میں لاکھوں انسان محض اس وجہ سے تباہ ہوئے ہیں کہ انہوں نے شروع شروع میں شراب کے چند قطرے پی کر جسم میں وقتی گرمی اور دماغ میں عارضی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی۔اور پھر ایسے پھسلے کہ دن رات مدہوش رہنے لگے یہی حال افیون اور مارفیا اور بھنگ اور چرس وغیرہ کے استعمال کا ہے کہ ان چیزوں کا تھوڑا تھوڑا استعمال بالآخر زیادہ استعمال کی طرف دھکیلتا ہے۔اور ساحلِ سمندر کے پایاب پانی میں کھیلنے والا انسان آخر کار غرقاب پانی میں پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے۔اسی لئے قرآن شریف نے شراب اور جوئے کے بعض فوائد کو تسلیم کرنے کے باوجود حکم دیا ہے کہ اثمھما اکبر من نفعھما ''یعنی بے شک شراب اور جوئے میں بعض فوائد بھی ہیں ۔لیکن ان کی مضرتوں کا پہلو ان کے فوائد کے پہلو سے بہت زیادہ بھاری ہے''۔پس سچے مومنوں کو بہر حال ان چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

اگر اس جگہ یہ سوال کیا جائے کہ چونکہ استثنائی طور پر بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے آپ کو شراب کے قلیل استعمال پر روک سکتے ہیں۔اوران کے متعلق اعتدال کی حد سے تجاوز کرنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔تو کیا ایسے لوگوں کے لئے شراب کا محدود استعمال جائز سمجھا جائے گا ؟تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ بلکہ پھر بھی شراب کا استعمال کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔کیونکہ اوّل تو اس قسم کے قوانین میں اکثریت اور عمومیت کے پہلو کو مدّنظر رکھا جاتا ہے۔یعنی جب ایک چیز

ملک وقوم کے کثیر حصہ کے لئے یقینی طور پر نقصان دہ ہوتو قانونی عمومیت کے پیشِ نظر یہ چیز قلیل حصہ کے لئے بھی حرام کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس قسم کے قوانین قائم نہیں رہ سکتے دوسرے اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ گو آج ایک شخص ضبط نفس سے کام لے سکتا ہے۔ مگر کل کو وہ پھسل کر اپنے ضبط کو کھو نہیں بیٹھے گا۔ تیسرے اس حدیث میں شراب کی ساری مضرتیں بیان نہیں کی گئیں۔ بلکہ صرف مثال کے طور پر نشہ یعنی مدہوشی والی مضرت کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ شراب کے بعض نقصانات اس کے علاوہ بھی ہیں۔ پس اگر بالفرض کسی خاص شخص کے متعلق شراب میں مدہوشی والی مضرت موجود نہ ہوتو پھر بھی وہ دوسری مضرتوں کی وجہ سے حرام سمجھی جائے گی اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ہر صورت میں حرام قرار دیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس حدیث میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تین اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے (اوّل) یہ کہ ہر نشہ پیدا کرنے والی چیز مسلمانوں پر حرام ہے۔خواہ وہ شراب ہو یا بھنگ یا چرس یا افیم ہو یا کوئی اور چیز ہو (دوم) یہ کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار کا استعمال بھی جائز نہیں ہوگا۔اس لئے کوئی شخص یہ بہانہ رکھ کر شراب یا افیم یا بھنگ وغیرہ استعمال نہیں کرسکتا کہ میں تو صرف ایسی مقدار میں استعمال کرتا ہوں جو نشہ پیدا نہیں کرتی (سوم) یہ کہ اس قسم کی بدیوں کے سدّ باب کا صحیح طریق یہ ہے کہ انہیں جڑ سے کاٹا جائے اور ان تمام امکانی رخنوں کا بند کیا جائے جہاں سے بدی داخل ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اگر بدی کے داخل ہونے کا رستہ کھلا ہوگا تو لازماً بدی کے داخل ہونے کا امکان بھی قائم رہے گا۔

﴿ 25 ﴾

دھوکا باز انسان سچا مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّيْ (مسلم)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جو شخص تجارت یا دوسرے لین دین میں دھوکا بازی سے کام لیتا ہے اور ظاہر و باطن ایک جیسا نہیں رکھتا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

تشریح: یہ ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب کہ آپؐ نے ایک غلّہ فروش کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا کہ وہ اندر سے گیلا تھا۔ مگر باہر سے خشک غلّہ کی تہ ڈال کر اس نقص کو چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس وقت آپ کا چہرہ غصّہ سے متغیر ہو گیا اور آپ نے غلّہ فروش کو انتہائی ناراضگی کے ساتھ فرمایا کہ یہ دھوکہ بازی اسلام میں جائز نہیں اور جو مسلمان دھوکا کرتا ہے اور خراب مال کو اچھا مال ظاہر کر کے بیچنا چاہتا ہے اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور آپ نے حکم دیا کہ اگر تمہارے مال میں کوئی نقص ہے تو اس نقص کو ظاہر کرو۔ اور پھر بیچو تا کہ تمہارا خریدار نقص کو مدّنظر رکھ کر قیمت کا فیصلہ کر سکے۔

آپ کی اس انتہائی تاکید کا یہ نتیجہ تھا کہ بعض اوقات صحابہ میں اس قسم کا

دلچسپ اختلاف ہوجاتا تھا کہ مثلاً بیچنے والا اپنے مال کی قیمت دوسو روپیہ بتاتا تھا۔ مگر خریدار کو اصرار ہوتا تھا کہ نہیں یہ مال تو تین سو روپے کا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل کئی مسلمان کہلانے والے لوگ تجارت میں بے دریغ دھوکا کرتے۔ قسمیں کھا کھا کر جھوٹ بولتے اور کھانے پینے کی چیزوں میں اس طرح ملاوٹ ملاتے ہیں کہ شاید شیطان بھی شرم سے منہ چھپاتا ہوگا۔ بلکہ بعض مسلمان تو حج بھی صرف اس خیال سے کرتے ہیں کہ حاجی کہلانے سے ان کی تجارت کو زیادہ فروغ حاصل ہوجائے گا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ سب ایسے ہیں۔ لیکن جہاں قوم کا ایک معتد بہ حصہ اس قسم کی اخلاقی پستی میں مبتلا ہو وہاں ایسی قوم بدنامی کے داغ سے ہرگز بچ نہیں سکتی اور بہرحال ہمارے مقدس رسول (فداہ نفسی) کا سچا متبع وہی سمجھا جاسکتا ہے جو آپ کے حکم کو مان کر ہر قسم کے دھوکے اور فریب سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ ورنہ وہ اس وعید کی زد سے بچ نہیں سکتا کہ مَنۡ غَشَّ فَلَیۡسَ مِنِّیۡ۔

﴿ 26 ﴾

دوسری قوموں کی مشابہت اختیار نہ کرو

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (ابو داؤد)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جو شخص (اپنی ملّت اور قوم کا طریق چھوڑ کر) کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اسی قوم میں سے سمجھا جائے گا۔

تشریح: یہ مختصر سی حدیث ایک نہایت لطیف نفسیاتی نکتہ پر مشتمل ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنی قوم کے طور وطریق اور اپنی قوم کے شعار کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ اس کا دل اس دوسری قوم کے طور وطریق اور اس کے شعار سے متاثر ہو کر اس کی ذہنی غلامی اختیار کر چکا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے تشبہ کی خواہش دراصل احساس کمتری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔یعنی ایک شخص کسی قوم کے تہذیب و تمدّن اور ان کے حالات و خیالات کو بہتر اور ارفع خیال کر کے اپنے آپ کو اُن کے مقابلہ میں پست اور ادنیٰ سمجھنے لگتا ہے۔ اور پھر ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر اس قوم کی اندھی تقلید شروع کر دیتا ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسا شخص دراصل اسی قوم میں سے سمجھا جائے گا۔

جس کی مشابہت وہ اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا اس لطیف حدیث کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہوشیار فرمایا ہے کہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے طریق و تمدّن کے نقّال نہ بنیں۔ بلکہ اسلام کے تمدن کو سارے دوسرے تمدّنوں سے بہتر اور ارفع خیال کر کے اسلامی شعار اختیار کریں ورنہ وہ ایک بدترین قسم کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر اپنی ممتاز ہستی اور اپنی ارفع انفرادیت کو کھو بیٹھیں گے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ ذہنی غلامی ظاہری غلامی سے بھی بدتر چیز ہے۔ ایک ظاہری غلام بے شک دوسرے شخص کا مملوک ہوتا ہے۔ مگر باوجود اس کے اس کے دل و دماغ آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن ذہنی غلامی میں مبتلا ہونے والا شخص بظاہر آزاد ہونے کے باوجود اپنے دل و دماغ کی ساری آزادی کھو بیٹھتا ہے اور اس کے اعمال اس بندر کے اعمال سے بہتر نہیں ہوتے جو محض نقالی جانتا اور دوسروں کے نچانے پر ناچتا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکیمانہ تعلیم کے باوجود آج کل کے مسلمانوں نے مغربی ممالک کی بدترین غلامی اختیار کر رکھی ہے۔ ہندوستان میں انگریز آیا تو مسلمانوں کے ایک معتد بہ حصے نے اس کی تہذیب و تمدن کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس کے رنگ میں رنگین ہونا شروع کر دیا مسلمانوں کی داڑھیاں غائب ہو گئیں۔ ان کے لباس کوٹ پتلون اور ٹائی کالر کے سامنے پسپا ہو گئے۔ ان کی دعوتوں میں شراب کے جام چلنے لگے۔ اور ان کی عورتیں زینت کے لباس پہن کر بازاروں میں نکل آئیں۔ کیا یہ سب کچھ مَنۡ تَشَبَّہَ بِقَوۡمٍ فَھُوَ مِنۡھُمۡ کی بدترین مثال نہیں؟ فاعتبرو ایااولی الابصار

بے شک یہ درست ہے کہ ایک فی الواقع اچھی اور مفید چیز کو اچھے رنگ میں

لے لینے میں کوئی حرج نہیں ۔ چنانچہ خود ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کلمة الحکمة ضالة المومن فحیث ما وجدھا فھوا حق بھا ۔ ''یعنی حکمت اور خوبی کی بات مومن کی اپنی ہی کھوئی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ اسے چاہئے کہ جہاں بھی ایسی چیز پائے اسے لے لے ۔ کیونکہ وہ اس کی اپنی ہی چیز ہے'' مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر رطب و یابس چیز کو اندھے طور پر اختیار کرنا شروع کر دیا جائے۔ بلکہ کسی چیز کے اختیار کرنے کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں:

(۱) ایک یہ کہ وہ فی الواقع اچھی ہو۔ اور اسلامی تعلیم اور اسلامی شعار کے خلاف نہ ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ اسے غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اندھے طریق پر اختیار نہ کیا جائے بلکہ پرکھ کر اور کھوٹا کھرا دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت لیا جائے۔

﴿ 27 ﴾

دل ٹھیک ہو تو سارے اعضاء خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ (بخاری)

ترجمہ: نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ انسان کے جسم میں ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے کہ جب وہ اچھا ہو جائے تو تمام جسم اچھا ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو تمام جسم خراب ہو جاتا ہے اور اے مسلمانو! ہوشیار ہو کر سُن لو کہ وہ دل ہے۔

تشریح: اس حدیث میں نفس کی اصلاح کا لطیف فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ انسان کے تمام اعمال کا منبع اس کا دل ہے اگر انسان کے دل میں نیک اور پاکیزہ جذبات ہوں گے تو اسکے سارے اعمال لازماً نیکی کے رستہ پر چلیں گے۔ لیکن اگر دل کے جذبات ناپاک اور گندے ہوں گے تو اعمال بھی لامحالہ گندے رستہ پر پڑ جائیں گے۔ کیونکہ دل کے جذبات بیج کا رنگ رکھتے ہیں اور عمل وہ درخت ہے جو اس بیج سے پیدا ہوتا ہے۔ پس اصلاح کے لئے اصل فکر دل کی ہونی چاہئے۔ اگر قوم کے لیڈر اور ملک کے اخبارات عوام الناس کے دلوں میں اور کالجوں کے پروفیسر اور

سکولوں کے اساتذہ طلباء کے دلوں میں اور والدین اپنے بچوں کے دلوں میں نیک جذبات پیدا کردیں اوران میں خدا کی محبت اور رسول کی محبت اور دین کی محبت کے ساتھ ساتھ قوم کے درد اور خدمت اورقربانی اورصداقت اور دیانت کا بیج بودیں تو پھر نیک اعمال کے لئے علیحدہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ دل کا تقویٰ خودبخود عمل صالح کا درخت اگانا شروع کردے گا لیکن اگر دل خراب ہے تو پھر عمل کا درخت اوّل تو اُگے گا ہی نہیں اور اگر اُگے گا تو فوراً ہی ٹھٹھر کرختم ہو جائے گا۔ حضرت مسیح موعود بانی سلسلہ احمدیہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

ہر اک نیکی کی جڑھ یہ اتقا ہے   اگر یہ جڑھ رہی سب کچھ رہا ہے

حق یہی ہے کہ انسان کا دل اس کے تمام نیک اعمال کا منبع اور مولد ہے اگر دل ٹھیک ہو تو ہاتھ اور پاؤں اور زبان اور آنکھ کے اعمال خودبخود ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر دل گندہ ہو تو انسان کے ہر عمل میں گندگی اور نجاست کی بُو پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان اگر بظاہر نیک عمل بجالاتا بھی ہو تو اس کے اعمال میں خشک نقالی یا منافقانہ ریا کے سوا کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ پس ہر مصلح کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے دل کی فکر کرے۔ کیونکہ دل جڑھ کا قائم مقام ہے۔ اور گندی جڑھ سے کبھی پاک درخت پیدا نہیں ہوسکتا۔

﴿ 28 ﴾

جو بات دل میں کھٹکے اس سے اجتناب کرو

عَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ۔ اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَ اطْمَأَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَاحَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَاِنِ اَفْتَاكَ النَّاسُ (مسند احمد)

ترجمہ: وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اپنے نفس سے فتوی لو۔ اپنے نفس سے فتوی لو۔ اپنے نفس سے فتوی لو۔ نیکی وہ ہے جس پر تمہارا نفس اطمینان پا جائے اور تمہارا دل تسکین محسوس کرے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے نفس میں کھٹکے اور تمہارے سینے میں تنگی پیدا کرے۔ خواہ دوسرے لوگ تمہیں اس کے جائز ہونے کا فتوی ہی دیں۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس ابدی صداقت پر مبنی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو خالق فطرت ہے ہر انسان کو پاک فطرت عطا کی ہے اور یہ صرف بعد کے حالات ہیں جو اسے غلط رستہ پر ڈال کر اس کی پاک فطرت کو ناپاک پردوں میں چھپا دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی فطرت کی نیکی اور ضمیر کی روشنی بالکل مُردہ نہیں ہوتی۔ اور زندگی بھر انسان کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتی ہے حتّٰی کہ بعض

اوقات دنیا کے گندوں میں پھنسے ہوئے لوگ بھی جب علیحدہ بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کرتے ہیں تو ان کی فطرت دنیاداری کے پردوں سے باہر آ کر انہیں ملامت شروع کر دیتی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد جو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے اسی فطری نور کی بنیاد پر قائم ہے۔فرماتے ہیں کہ عام اصولی امور میں ایک عقل مند متقی انسان کے لئے کسی خارجی مفتی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ خود اس کا اپنا دل اس کے لئے مفتی کی حیثیت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ نیکی اور بدی کے متعلق اپنے دل سے فتوٰی پوچھے اور اپنے ضمیر کے نور سے روشنی کا طالب ہو۔کیونکہ نیکی دل میں شرح صدر اور تسکین اور اطمینان کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔اور بدی سینہ میں کھٹکتی اور دل میں چبھتی اور نفس پر ایک بوجھ بن کر بیٹھ جاتی ہے ایسی صورت میں دوسروں کے فتووں سے جھوٹا سہارا تلاش کرنا بے سود ہے۔ بلکہ انسان کو اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرنا چاہئے اور اگر کسی بات پر ضمیر رُکتا اور دل تنگی محسوس کرتا ہے تو انسان کو چاہئے کہ مفتیوں کے فتوے کے باوجود ایسے کام سے رُک جائے۔اور نور ضمیر کے فتوٰی کو قبول کرے۔جو خالقِ فطرت کی پیدا کی ہوئی ہدایت ہے۔

لیکن جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استفت نفسک (اپنے نفس سے فتوٰی پوچھ) کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے ضروری ہے کہ دل کا فتوٰی لینے کے لئے انسان دوسروں سے علیحدہ ہو کر خلوت میں سوچے۔اور تقوٰی کو مدّ نظر رکھ کر اپنے دل کا فتوٰی لے ورنہ دوسروں کی رائے اس کی ضمیر پر غالب آ کر اس کی شمع فطرت پر پردہ ڈال دے گی۔لیکن اگر وہ علیحدگی میں بیٹھ کر اور تمام خارجی اثرات سے الگ ہو کر اپنے دل سے فتوٰی پوچھے گا تو اس کے دل کی فطری روشنی اس کے

لئے ایسی شمع ہدایت مہیا کر دے گی جسے ازل سے نیکی بدی میں امتیاز کرنے کی طاقت حاصل ہو چکی ہے۔اور اگر غور کیا جائے تو یہ نیکی بدی کا فطری شعور خدا کی ہستی پر بھی ایک بھاری دلیل ہے۔کیونکہ اگر نعوذ باللہ خدا کوئی نہیں تو یہ نیکی بدی کا فطری شعور جو انسان کی دل کی گہرائیوں میں مرکوز ہو کر اس کی ہدایت کا سامان مہیا کر رہا ہے کہاں سے آ گیا ہے؟

﴿29﴾

احساسِ کمتری ایک سخت مُہلک احساس ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكَهُمْ (مسلم)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص دوسرے لوگوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ہلاک ہوگئے تو ایسا شخص خود یہ بات کہہ کر انہیں ہلاک کرتا ہے (یا یہ کہ ایسا شخص خود ان سے زیادہ ہلاک شُدہ ہوتا ہے)

تشریح: یہ حدیث ایک عظیم الشان نفسیاتی نکتہ پر مبنی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں احساس کمتری (انفیری آریٹی کامپلیکس) یا شکست خوردہ ذہنیت (ڈیفی ٹسٹ ٹنڈنسی) کا نام دیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں امید ورجا اور خود اعتمادی اور عزت نفس کے جذبات کو بیدار کر کے اوپر اٹھانے اور بلند کرنے کی کوشش کرو نہ کہ احساسِ کمتری اور شکست خوردہ ذہنیت کے ذریعہ مایوسی اور پست ہمتی پیدا کر کے انہیں قعرِ مذلت میں گرانے کا رستہ کھولو۔ جو شخص لوگوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور کمزوریوں پر واویلا شروع کر دیتا ہے کہ یہ لوگ تو مر گئے اور تباہ ہو گئے۔ اور خود اس بات کے کہنے سے ان کے دلوں میں مایوسی اور احساسِ کمتری پیدا کر کے ان کی تباہی کا رستہ کھولتا ہے۔ پس

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کمالِ حکمت سے ہدایت فرمائی ہے کہ بے شک غلطیوں پر مناسب تادیب اور اصلاح کا طریق اختیار کرو۔مگر بات بات پر یہ شور مچانا کہ فلاں لوگ اپنی بدعملی میں تباہی کی حد کو پہنچ گئے ہیں خود اپنے ہاتھ سے ان کی تباہی کا بیج بونا ہے۔جس سے ہر دانا مصلح کو پرہیز کرنا چاہئے۔

اس معاملہ میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا مبارک اسوہ یہ تھا کہ جب ایک دفعہ صحابہ کی ایک پارٹی جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنگی مہم پر بھیجا تھا۔میدان جنگ سے بھاگ کر مدینہ میں واپس پہنچ گئی تو اس خیال سے کہ اسلام میں دشمن کے سامنے سے بھاگنا حرام ہے ان پر ایسی شرم اور ندامت غالب تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں آتے تھے۔جب آپؐ نے اُنہیں مسجد کے ایک کونہ میں منہ چھپا کر بیٹھے ہوئے دیکھا تو آپ اُنکی طرف گئے اور اُنہیں آواز دے کر پکارا کہ تم کون لوگ ہو؟ اُنہوں نے شرم کی وجہ سے آنکھیں نیچے کئے ہوئے عرض کیا کہ نَحۡنُ الفرارون ''یا رسول اللہ ہم بھگوڑے ہیں۔'' آپؐ نے اُن کی شکست خوردہ ذہنیت کو بھانپ کر فوراً جواب دیا کہ لا بل انتم العکارون و انا فئتکُمۡ ''یعنی نہیں نہیں۔تم بھگوڑے نہیں ہو۔تم تو زیادہ زور سے حملہ کرنے کے لئے پیچھے ہٹے تھے اور تم کسی غیر کے پاس نہیں گئے بلکہ میرے پاس آئے ہو۔جو تمہارا قائد بن کر تمہیں پھر میدانِ جنگ میں لے جانے والا ہوں۔'' پستی میں لڑھکتے ہوئے اور احساس کمتری کی لہروں میں تھپیڑے کھاتے ہوئے نوجوانوں کے کانوں میں آپؐ کی یہ روح پرور آواز پہنچی اور وہ ایک جست کے ساتھ آگے بڑھے اور آپؐ کے دستِ مبارک کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خوشی سے چومنے لگ گئے یہ وہ

درسِ حکمت ہے جو ہمارے آقا فداہ نفسی نے اپنے صحابہ کو عملاً دیا اور جس کی آپ نے اوپر کی حدیث کے ذریعہ قولاً تلقین فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍوَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ

اس حدیث میں جو اھلکھم کا لفظ آتا ہے یعنی ''ایسا شخص خود انہیں ہلاک کرنے والا ہے''۔اس کے دوسرے معنی اعراب کی خفیف تبدیلی کے ساتھ (یعنی لام کی پیش سے) یہ بھی ہیں کہ ''وہ خود سب سے زیادہ ہلاک شدہ ہے'' اور ظاہر ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے بھی یہ حدیث نہایت لطیف مفہوم کی حامل قرار پاتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ایسا شخص جو دوسروں کو ہلاک شدہ قرار دیتا ہے وہ دراصل خود سب سے زیادہ شکست خوردہ ذہنیت میں مبتلا ہے۔ پس خواہ دوسرے لوگ ہلاک شدہ ہوں یا نہ ہوں وہ یہ الفاظ کہہ کر اپنی ہلاکت پر ضرور مُہر لگا لیتا ہے۔

﴿ 30 ﴾

سچّی توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے

عَنْ اَبِیْ عُبَیْدَۃَ ابْنُ عَبْدِ اللہِ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ

(ابن ماجه)

ترجمہ: ابوعبیدہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا شخص ایسا ہوتا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

تشریح: توبہ کا فلسفہ نہ صرف انسان کی روحانیت پر بلکہ اس کے اخلاق پر بھی نہایت گہرا اثر رکھتا ہے۔ توبہ کے ذریعہ انسان خدا کی طرف سے پُراُمید رہتا ہے۔ اور اپنے اخلاق میں زیادہ بلندی اختیار کر سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اسلام کے سوا اکثر مذاہب نے انسان پر توبہ کا دروازہ بند قرار دے کر اس کے اندر ایک طرف خدا کے متعلق بدگمانی اور دوسری طرف مایوسی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھولا ہے۔ چنانچہ مسیحیت نے توبہ کا دروازہ بند کر کے ایک سراسر مصنوعی اور غیر فطری عقیدہ یعنی کفارہ میں پناہ لی ہے۔ اور ہندو مذہب نے اپنے متبعین کو اواگون یعنی تناسخ کی دلدل میں پھنسا رکھا ہے۔ حالانکہ توبہ کا مسئلہ ایک بالکل فطری مسئلہ ہے۔ جس کے بغیر نہ تو انسان کی روحانیت مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے اخلاق کمال

حاصل کر سکتے ہیں۔

پھر تعجب یہ ہے کہ توبہ کا دروازہ بند کرنے والے مذاہب اس دنیا کے خالق و مالک خدا میں وہ اچھے اخلاق بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جو ایک نیک انسان میں قابلِ تعریف سمجھے جاتے ہیں۔ایک شریف انسان ہر روز اپنے بچوں اور اپنے دوستوں اور اپنے ماتحتوں اور اپنے نوکروں کی غلطیاں معاف کرتا ہے۔اور اس کے اس فعل کو قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے۔لیکن افسوس ہے کہ خدا کے لئے اس کریمانہ خلق کو ناجائز خیال کیا گیا ہے۔اور ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی انسان خدا کا کوئی گناہ کرے تو پھر خواہ اس کے بعد وہ کیسا ہی نادم اور تائب ہو خدا کو اسے کچل کر رکھ دینا چاہیئے اسلام اس گندے نظریئے کو دور سے ہی دھکے دیتا ہے۔اور ہر سچے توبہ کنندہ کے لئے خدائی مغفرت اور رحمت کا دروازہ کھولتا ہے۔اور اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان ایک طرف سے شفقت و رحمت کی اور دوسری طرف سے انابت و امتنان کی ایسی نہر جاری کر دیتا ہے جو خدا کی خدائی اور بندے کی بندگی کے شایانِ شان ہے ظاہر ہے کہ انسان کمزور ہے اور بسا اوقات وقتی اثرات کے ماتحت لغزش کھا جاتا ہے۔تو اس صورت میں یہ کتنا ظلم ہے کہ اگر وہ بعد میں سچے دل سے نادم اور تائب ہو تو پھر بھی اسے کشتنی اور گردن زدنی قرار دیا جائے!

یہ خیال کرنا کہ توبہ قبول کرنے سے گناہ پر جرأت پیدا ہوتی ہے بالکل موہوم اور باطل خیال ہے۔ سچی توبہ تو انسان کو پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔نہ کہ گناہ پر دلیر کرنے کا موجب۔ کیونکہ اسلام نے سچی توبہ کے لئے ایسی شرطیں لگا دی ہیں جو توبہ کو ایک بھاری انقلاب اور حقیقی قلب ماہیت کا رنگ دے دیتی ہیں اور جیسا کہ قرآن

شریف اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ شرطیں تین ہیں:

(۱) یہ کہ توبہ کرنے والا اپنی غلطی اور گناہ پر سچے دل سے ندامت محسوس کرے۔ اور صمیمِ قلب سے معافی اور مغفرت کا طالب ہو۔

(۲) یہ کہ وہ آئندہ کے لئے اس غلطی اور گناہ سے مجتنب رہنے کا عہد کرے۔ اور اس کے لئے خدا سے توفیق مانگے۔

(۳) یہ کہ اگر اس کی غلطی اور گناہ کی عملی تلافی ممکن ہے تو وہ اس کی تلافی کرے۔ مثلاً اگر اس نے کسی شخص کا مال غصب کیا ہوا ہے تو وہ اسے واپس کرے یا کسی کا حق دبایا ہوا ہے تو اسے بحال کرے۔

اِن شرائط کے ساتھ کون عقل مند انسان توبہ کو قابلِ اعتراض خیال کر سکتا ہے؟ حق یہ ہے کہ سچی توبہ ایک موت ہے جو انسان کو نئی زندگی بخشتی اور خدا کی رحمت اور شفقت اور مغفرت کا رستہ کھولتی ہے اور یہ صرف اسلام ہی ہے جو انسان کے لئے سچی توبہ کا دروازہ کھولتا ہے۔

﴿ 31 ﴾

مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں کاٹا جاتا

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ قَالَ لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَرَّتَيْنِ (بخاری)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں کاٹا جاتا۔

تشریح: یہ لطیف حدیث بڑے وسیع مفہوم پر مشتمل ہے اس کے صاف اور سیدھے معنی تو یہ ہیں کہ سچا مومن ہمیشہ ہوشیار اور چوکس رہتا ہے۔ اور اگر وہ کسی سوراخ کے اندر ہاتھ ڈالتا ہے (یعنی کسی شخص یا پارٹی یا قوم کے ساتھ اس کا واسطہ پڑتا ہے) اور اس سوراخ کے اندر سے اسے کوئی چیز کاٹ لیتی ہے تو پھر وہ دوسری دفعہ اس سوراخ میں سے نہیں کاٹا جاتا۔ یعنی وہ ایک ہی تجربہ کے نتیجہ میں ہوشیار ہو کر مزید نقصان سے بچ جاتا ہے اور دوسرے فریق کو یہ موقع نہیں دیتا کہ وہ اسے دوبارہ ڈنک مارے۔ اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا مسلمانوں کو غیر معمولی طور پر ہوشیار اور چوکس رہنے کی تلقین فرمائی ہے اور سچے مومن کی یہ علامت بتائی ہے کہ وہ مومنانہ حسن ظنّی کی وجہ سے ایک دفعہ نقصان اٹھا جائے تو اٹھا جائے۔ مگر ایک ہی شخص سے یا ایک ہی معاملہ میں دوبارہ نقصان نہیں اٹھاتا۔ اور ہر تلخ تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی پوزیشن کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا ہے۔ اور اپنے لئے

ترقی کے ایک دروازہ کے بعد دوسرا دروازہ کھولتا چلا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد زندگی کے ہر شعبہ سے ایک جیسا تعلق رکھتا ہے مثلاً اگر کسی مسلمان کو کوئی تاجر ایک دفعہ دھوکا دے تو یہ حدیث مسلمان کو ہوشیار کر رہی ہے کہ دیکھنا پھر دوسری دفعہ اس بد دیانت تاجر سے دھوکا نہ کھانا۔ اور اگر کوئی پیشہ ور کسی مسلمان کے ساتھ خیانت کے ساتھ پیش آئے تو یہ حدیث اس مسلمان کو بھی متنبہ کر رہی ہے کہ ایسے خیانت پیشہ شخص سے دوسری بار زِک نہ اُٹھائے۔ اور اگر کوئی شخص دوست بن کر مسلمان کو اپنے فریب کا شکار بنائے تو یہ حدیث اس مسلمان کو بیدار کر رہی ہے کہ پھر کبھی ایسے فریب میں نہ آنا۔ الغرض اس حدیث کا دائرہ بہت وسیع ہے بلکہ اگر کوئی شخص کسی چیز کو گناہ نہ خیال کرتے ہوئے اس کا مرتکب ہوتا ہے۔ یا گناہ تو خیال کرتا ہے مگر اس کے نقصان کی اہمیت کو نہیں سمجھتا۔ اور صرف تجربہ کے بعد اس کی مضرت کو محسوس کرتا ہے تو یہ حدیث اس کے لئے بھی ایک شمعِ ہدایت کا کام دے رہی ہے کہ اب پھر اس چیز کے قریب نہ جانا ورنہ تم ایک سوراخ سے دو دفعہ کاٹے جاؤ گے۔ جو ایک مومن کی شان سے بعید ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ لطیف حدیث ہر مسلمان کو ہوشیار کر رہی ہے کہ دنیا میں چوکس ہو کر رہو اور ہر ٹھوکر کو اپنے قدموں کی مضبوطی کا موجب بناؤ۔ اور ہر لغزش کے بعد اس طرح جست کر کے اُٹھو کہ پھر کبھی لغزش نہ آئے اور اس کے بعد بڑھتے چلے جاؤ۔ اور آگے ہی بڑھتے چلے جاؤ۔

﴿ 32 ﴾

اچھے اخلاق سے بہتر کوئی عمل نہیں

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ شَیءٍ فِی الْمِیْزَانِ اَثْقَلَ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ (ابو داؤد)

ترجمہ: ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ خدا کے تول میں کوئی چیز اچھے اخلاق سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

تشریح: اعلیٰ اخلاق دین کا آدھا حصہ ہوتا ہے۔ اور اسلام نے اخلاق پر انتہائی زور دیا ہے۔ حتّٰی کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اخلاق سے بڑھ کر خدا کے ترازو میں کسی چیز کا وزن نہیں۔ اور ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ جو شخص بندوں کا شکر گزار نہیں بنتا وہ خدا کا بھی شکر گزار نہیں بن سکتا۔ دراصل اعلیٰ اخلاق ہر نیکی کی بنیاد ہیں۔ حتّٰی کہ روحانیت بھی درحقیقت اخلاق ہی کا ایک ترقی یافتہ مقام ہے۔ اسی لئے ہمارے آقا نے اخلاق کی درستی پر بہت زور دیا ہے۔ اور اس بارے میں اتنی حدیثیں بیان ہوئی ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔

اس کے علاوہ اسلام نے اعلیٰ اخلاق کے اظہار کے لئے کسی حقدار کے حق کو نظر انداز نہیں کیا۔ خدا سے لے کر بندوں تک اور پھر بندوں میں بادشاہ سے لے

کرادنیٰ خادم تک ہر ایک کے بارے میں حُسنِ خلق کی تاکید فرمائی ہے۔افسر ماتحت۔باپ بیٹے ،خاوند بیوی،بہن بھائی،ہمسایہ،اجنبی،دوست دشمن، انسان حیوان ہرایک کے حقوق مقرر فرمائے ہیں۔اور پھران حقوق کو بہترین صورت میں ادا کرنے کی ہدایت دی ہے۔اور کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔حتٰی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر تم اپنے ملنے والوں کو مسکراتے ہوئے چہرہ سے مل کر ان کے دل کو خوش کرو تو یہ بھی تمہارا ایک نیک خلق ہوگا اور تمہیں خدا کے حضور ثواب کا مستحق بنائے گا۔اور دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں کہ رستہ چلتے ہوئے اگر کوئی کانٹے دار چیز یا پاؤں کو پھسلانے والا چھلکا یا ٹھوکر لگانے والا پتھر یا بدبو پیدا کرنے والی گندی چیز وغیرہ نظر آئے تو اسے رستہ سے ہٹا دو۔تاکہ تمہارا کوئی بھائی اس کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔

خود آپ کے اپنے اخلاق فاضلہ کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی سوالی کو رد نہیں کیا۔کبھی کسی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے چھوڑنے میں پہل نہیں کی۔یتیموں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔بیواؤں کی دستگیری فرمائی۔ہمسایوں کو اپنے حسنِ سلوک سے گرویدہ کیا۔چھوٹے سے چھوٹے صحابی کی بیماری کا سنا تو اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اس سے شفقت اور محبت کا کلام کر کے اس کی ہمت بڑھائی۔مدینہ میں ایک غریب بوڑھی عورت رہتی تھی۔جو ثواب کی خاطر مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔وہ چند دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر نہیں آئی تو آپؐ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ فلاں عورت خیریت سے تو ہے؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ بیچاری تو مختصر سی بیماری کے بعد فوت ہوگئی۔اور ہم نے آپ کی تکلیف کے خیال سے

آپ کو اس کے جنازہ کی اطلاع نہیں دی۔ آپؐ خفا ہوئے کہ مجھے کیوں بے خبر رکھا۔ اور پھر اس کی قبر پر جا کر دعا فرمائی۔

ایک دفعہ غالباً پردہ کے احکام سے پہلے جب کہ آپؐ اپنی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ کے پاس تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص آپؐ سے ملنے کے لئے آیا آپؐ نے اس کی اطلاع پا کر حضرت عائشہ سے فرمایا: یہ آدمی اچھا نہیں ہے مگر جب یہ شخص آپؐ کے پاس آیا تو آپؐ نے بڑی شفقت اور دلداری کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ نے آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپؐ اس شخص کو برا کہتے تھے۔ مگر جب وہ آپؐ سے ملا تو آپ نے بڑی دلداری اور شفقت کے ساتھ اس سے باتیں کیں؟ آپؐ نے فرمایا۔ عائشہ: کیا میرا یہ فرض نہیں کہ لوگوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤں؟ ابوسفیان اسلام لانے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دشمن تھا۔ مگر جب قیصر رُوما نے اس سے پوچھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو کیا تعلیم دیتا ہے۔ اور کیا اس نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی بدعہدی یا غدّاری کی ہے؟ تو ابوسفیان کی زبان سے اس کے سوا کوئی الفاظ نہ نکل سکے کہ وہ بُت پرستی سے روکتا ہے اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور اس نے آج تک ہمارے ساتھ کوئی بدعہدی نہیں کی۔

آپؐ کے یہ اخلاق فاضلہ صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ آپؐ نے بے زبان جانوروں تک کو بھی اپنی شفقت میں شامل فرمایا۔ چنانچہ آپؐ اپنے صحابہ کو ہمیشہ تاکید فرماتے تھے کہ فِیْ کُلِّ کَبِدٍ رَطْبَۃٍ اَجْرٌ یعنی ''یاد رکھو کہ ہر جاندار چیز پر رحم کرنا ثواب کا موجب ہے'' ایک موقعہ پر ایک اونٹ جس پر زیادہ

بوجھ لاد دیا گیا تھا تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ آپؐ اسے دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور اس کے قریب جا کر اس کے سر پر محبت کے ساتھ ہاتھ پھیرا اور اس کے مالک سے کہا کہ یہ بے زبان جانور تمہارے ظلم کی شکایت کر رہا ہے۔ اس پر رحم کرو۔ تا تم پر بھی آسمان پر رحم کیا جائے۔

یہ وہ اخلاق ہیں جو ہمارے آقا نے ہمیں سکھائے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان ان اخلاق کو فراموش کر چکے ہیں۔

﴿ 33 ﴾

دوسری قوموں کے معزز لوگوں کا احترام کرو

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاكُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ فَاَكْرِمُوْهُ (ابن ماجہ)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جب تمہارے پاس کسی قوم کا بڑا آدمی آئے تو اس کا واجبی اکرام کیا کرو۔

تشریح: ملکوں اور قوموں اور پارٹیوں کے تعلقات کے استوار رکھنے کا بہترین ذریعہ ایک دوسرے کے لیڈروں کا اکرام و احترام ہے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں بھی مسلمانوں کو سخت تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث جو اس قسم کی دوسری بہت سی حدیثوں میں سے بطور نمونہ لی گئی ہے اس سنہری ارشاد کی حامل ہے۔ اختلافات جس طرح افراد کے درمیان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح قوموں اور ملکوں کے درمیان بھی اختلافات ہوتے رہتے ہیں ۔مگر ان اختلافات کے زہر کو کم کرنے کا بہترین ذریعہ ایک دوسرے سے حُسنِ اخلاق سے پیش آنا ہے۔ اور اس تعلق میں دوسری قوموں اور پارٹیوں کے لیڈروں کا واجبی احترام کرنا بڑا بھاری اثر رکھتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب بھی تمہارے پاس کسی قوم یا پارٹی کا کوئی رئیس یا لیڈر آئے تو خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو

اس کے ساتھ واجبی احترام سے پیش آؤ۔اور اس کے خاطر خواہ اکرام میں ہرگز غفلت سے کام نہ لو۔اس زریں ہدایت میں مہمان نوازی اور حسنِ اخلاق اور حسنِ سیاست تینوں صفات حسنہ کا بہترین خمیر ہے۔

اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی اسوہ یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ آپؐ نہایت درجہ سادہ مزاج تھے ۔اور لباس اور خوراک میں کوئی تکلّف کا پہلو نہیں تھا۔مگر آپؐ نے بیرونی قوموں کے وفدوں کے استقبال کے لئے خاص لباس رکھا ہوا تھا ۔اور جب بھی کوئی وفد آتا تھا آپؐ اس خاص لباس کو پہن کر اس سے ملاقات فرماتے تھے تا کہ آپؐ باہر سے آنے والے مہمانوں کا واجبی اکرام کر سکیں۔اور آپؐ کو وفود کے اکرام کا اتنا خیال تھا کہ مرض الموت میں وصیت فرمائی کہ میرے پیچھے وفدوں کے اکرام میں کمی نہ آنے دینا۔ایک دفعہ ایک سفیر نے آپؐ کے روبرو نہایت گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔آپؐ نے فرمایا تم ایک قوم کے سفیر ہو کر آئے ہو۔اس لئے میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔مکّہ فتح ہوا تو آپؐ نے عام اعلان فرمایا کہ جو شخص مقابلہ سے دست کش ہو کر اپنے گھر کے اندر بیٹھا رہے گا اور دوسروں کے گھروں میں جا جا کر سازشوں کی سکیمیں نہیں سوچے گا وہ ہماری طرف سے امن میں ہے۔اس پر ابوسفیان رئیس مکّہ نے کہا کہ میں قریش کا سردار ہوں۔میرا کچھ مخصوص اکرام بھی ہونا چاہئے۔آپ نے فرمایا۔بہت اچھا۔آپ کا گھر مستثنٰی ہے۔پس جو شخص اپنے گھر کے اندر بیٹھا رہے گا یا تمہارے گھر میں پناہ لے گا وہ ہماری پناہ میں ہے۔الغرض آپؐ نے دوسری قوموں کے لیڈروں کا انتہائی اکرام کیا اور اپنے صحابہ کو بھی اس کی تاکید فرمائی اور یہی وہ تعلیم ہے جو دنیا میں امن اور دلوں کی صفائی کا موجب بن سکتی ہے۔

﴿ 34 ﴾

مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دو

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهٗ (ابن ماجه)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دیا کرو۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں قوموں کے رئیسوں اور لیڈروں کے واجبی اکرام کی تاکید فرمائی ہے۔ وہاں غریبوں اور کمزور لوگوں کے حقوق کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اور چونکہ مزدور طبقہ عموماً غربت کی انتہائی حالت میں ہوتا ہے۔ اس لئے آپؐ نے مزدوروں کے حقوق کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ اور ارشاد فرمایا کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اسے اجرت دو۔ ان حکیمانہ الفاظ میں آپؐ کی غرض صرف یہی نہیں تھی کہ اجرت کی ادائیگی میں جلدی کی جائے اور بس۔ بلکہ دراصل ان الفاظ میں مزدوروں اور غریبوں کے حقوق کی طرف عمومی توجہ دلانا اصل غرض تھی۔ اور چونکہ اجرت کی بروقت ادائیگی مزدوروں کے حقوق کا سب سے ادنیٰ حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے آپؐ نے مثال کے طور پر اس ادنیٰ حصّہ کا ذکر کر کے تاکید فرما دی تا کہ ادنیٰ حصہ کی طرف توجہ خود بخود اعلیٰ حصوں کی

حفاظت کا موجب بن جائے۔اس میں کیا شبہ ہے کہ جو مصلح اجرت کی ادائیگی کے لئے مزدور کا پسینہ خشک ہونے کی بھی مہلت نہیں دیتا وہ دراصل ان الفاظ میں یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ مزدور کو اس کی پوری پوری اجرت دو۔اس کے واجبی آرام کا خیال رکھو اور اس پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالو جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ چنانچہ جو تعلیم آپؐ نے خادموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے بارے میں دی ہے یا جو ارشاد آپؐ نے اسلامی اخوت اور اسلامی مساوات کے متعلق فرمایا ہے (جس کی کسی قدر تفصیل خاکسار مؤلف کی کتاب سیرۃ خاتم النبیین حصہ نمبر۲ و نمبر۳ میں بیان کی جا چکی ہے) وہ اس بات پر شاہد ہے کہ ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غریب طبقہ کے کتنے ہمدرد کتنے بہی خواہ اور ان کے حقوق کے کس درجہ محافظ تھے۔

آپؐ نے انفرادی جد و جہد کے محرک کو زندہ رکھنے اور ہر شخص کو اس کی ذاتی سعی کے ثمرہ سے حصّہ دینے کے لئے بے شک انفرادی جائیداد کی اجازت مرحمت فرمائی۔مگر ساتھ ہی زکوٰۃ، اور حرمتِ سود اور تقسیم ورثہ وغیرہ کے زریں اصولوں کے ذریعہ دولت کو سموتے رہنے کی بھی ایک مؤثر مشینری قائم فرما دی۔اور جو فرق بھی باقی رہ جائے اس کے متعلق ایک دوسری حدیث میں غریبوں کی دلداری کے لئے فرمایا کہ تم لوگ اگر ایمان پر قائم رہو تو امیروں کی نسبت پانچ سو سال پہلے جنّت میں جاؤ گے اور ظاہر ہے کہ آخرت کی جاودانی زندگی کے مقابل پر دنیا کی چارروزہ زندگی کیا حقیقت رکھتی ہے؟ اور پھر یہ کہتے ہوئے غریبوں کی مزید تسلّی فرمائی کہ الفقر فخری۔یعنی اے میری امت کے غریب لوگو! دیکھو میں نے اپنے واسطے بھی دنیا کی کوئی دولت جمع نہیں کی۔ بلکہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم میں سے ہی ایک

غریب انسان ہوں۔اوراس فقر میں ہی میرا فخر ہے۔

دوسری طرف اوپر کی حدیث میں ''پسینہ خشک ہونے سے پہلے'' کے الفاظ فرما کر یہ لطیف اشارہ بھی کیا ہے کہ خدا کے نزدیک سچا مزدور وہ ہے جو اپنے کام میں پسینہ بہاتا ہے۔یونہی دکھاوے کے طور پر کام کرنے والا اور مالک کی نظر سے اوجھل ہونے پر سستی دکھانے والا خیانت کرنے والا شخص ہرگز خدا کے نزدیک سچا مزدور نہیں سمجھا جا سکتا پس اگر ایک طرف آقا کا فرض ہے کہ وہ اجیر کو واجبی مزدوری دے اور اس کی مزدوری میں دیر نہ کرے اور اس کے حقوق کا خیال رکھے تو دوسری طرف مزدور کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں پسینہ بہا کر اپنے آپ کو سچا اور دیانت دار مزدور ثابت کر دے۔یہی وہ وسطی تعلیم ہے جو مالک اور مزدور اور آقا اور اجیر کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کر کے سوسائیٹی میں حقیقی امن کی بنیاد بن سکتی ہے۔

﴿ 35 ﴾

بدترین دعوت وہ ہے جس میں صرف امیروں کو بلایا جائے

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرُّ الطَّعَامِ الْوَلِيْمَةِ يُدْعٰى لَهَا الْاَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَآءُ وَمَنْ تَرَكَ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللهَ وَرَسُوْلَهٗ (بخاری)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ بدترین دعوت وہ ہے جس میں امیر لوگ تو بلائے جائیں مگر غریبوں کو نظرانداز کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف جو شخص کسی کی دعوت کو رد کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔

تشریح: اسلام نے دولت کے سمونے اور غریب و امیر کے فرق کو کم سے کم حد کے اندر محدود کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ظاہر اور عیاں ہے اس تعلق میں سب سے زیادہ باعث تکلیف اور باعثِ اعتراض تمدنی میل ملاپ کا فرق ہوتا ہے۔ جو گویا امیروں اور غریبوں کو دو علیحدہ علیحدہ کیمپوں کی صورت دے کر ان کے اندر ایک دائمی رقابت اور کش مکش کا رنگ پیدا کر دیتا ہے اسلام نے اس کش مکش کو دور کرنے اور اس جذباتی فرق کو سمونے کے لئے انتہائی کوشش کی ہے چنانچہ سب سے پہلے تو اسلام نے سارے مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دے کر ایک لیول پر کھڑا کر دیا ہے اور پھر

حقوق کے معاملہ میں سب کے واسطے ترقی کا ایک جیسا رستہ کھول کر ملکی اور قومی عہدوں کو کسی ایک فریق کی اجارہ داری نہیں بننے دیا۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ قومی اور ملکی عہدہ داروں کا انتخاب بلالحاظ غریب و امیر و بلالحاظ قوم وقبیلہ محض اہلیت کی بناء پر ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ غریبوں اور امیروں میں تمدنی تعلقات کو ترقی دینے اور انہیں گویا ایک خاندان کی صورت میں اکٹھا رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کوئی امیر شخص دعوت کرے تو اس میں لازماً غریبوں کو بھی بلائے۔ اور جب کوئی غریب شخص دعوت کرے تو امیر لوگ ایسی دعوت میں شرکت سے ہرگز انکار نہ کریں چنانچہ موجودہ حدیث اسی ارشاد پر مشتمل ہے۔اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور کن زوردار الفاظ میں فرماتے ہیں کہ ''بدترین دعوت وہ ہے جس میں امیر لوگوں کو تو بلایا جائے۔مگر غریبوں کو نظر انداز کر دیا جائے''۔اور پھر دوسری طرف امیروں کو متنبہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی غریب شخص تمہاری دعوت کرے تو تمہارے لئے ہرگز جائز نہیں کہ اس کی غربت کا خیال کر کے اس کی دعوت کو رڈ کر دو اور جو شخص ایسا کرے گا۔''وہ خُدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے'' اور ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ:۔

لَوْ دُعِیْتُ اِلیٰ کرا عٍ لَاُجِبْتُ

''یعنی اگر کوئی غریب شخص بکری کا ایک کُھر یا پایہ پکا کر بھی مجھے اپنے گھر پر بلائے تو میں اس کی دعوت کو ضرور قبول کروں گا''۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

سے نا دانستہ طور پر بلالؓ اور بعض دوسرے غریب مسلمانوں کی کچھ دل شکنی ہو گئی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''ابو بکر جن غریبوں کا دل دکھا ہے ان کی دلداری کرو کیونکہ ان کی دلداری میں خدا کی خوشنودی ہے'' حضرت ابو بکرؓ فوراً ان لوگوں کے پاس گئے اور عاجزی سے عرض کیا ''بھائیو! مجھے خدا کے لئے معاف کرنا۔ میری نیّت دل شکنی کی نہیں تھی''۔ کیا اس تعلیم کے ہوتے ہوئے ایک سچی اسلامی سوسائیٹی میں کوئی نا گوار طبقے پیدا ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ قصور ہمارا ہے۔ جنہوں نے اسلام کی تعلیم کو بھلا کر سوسائیٹی میں رقیبانہ کیمپ قائم رکھے ہیں۔

﴿ 36 ﴾

اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ قَالَ وَ ھُوَ عَلَی الْمِنْبَرِ وَ ھُوَ یَذْ کُرُ الصَّدَقَۃَ وَ التَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْئَلَۃِ اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی

(مو طا امام مالك)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا اور اس میں ایک طرف صدقہ وخیرات کی اور دوسری طرف سوال سے بچنے کی نصیحت فرمائی ۔اور فرمایا ’’اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔‘‘

تشریح: غربت اور فقر کے تمام امکانی خطرات میں سب سے زیادہ سنگین پہلو دنائت اور پست خیالی اور دوسروں کے سہارے پر زندگی گذارنے کی عادت ہے۔جواکثر غریبوں میں پیدا ہوجاتی ہے جب ایک غریب انسان امیروں کی فارغ البالی کی طرف دیکھتا ہے تو ایک طرف اس کے اندر پست خیالی اور احساسِ کمتری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کیلئے متمول لوگوں سے سوال کرنے کا عادی ہوجاتا ہے۔ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

دور بین نظر نے غربت کے اس امکانی خطرہ کو دیکھا اور آپ کی روح اس خطرہ کے سدّ باب کیلئے بے چین ہو گئی۔ چنانچہ آپ کے احکام اس قسم کے ارشادات سے بھرے پڑے ہیں جن میں سوال کرنے کو انتہائی کراہت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اور غریبوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ محنت کی روزی کمائیں اور سوال کرنے سے پرہیز کریں۔ زیر نظر حدیث بھی ان حدیثوں میں سے ایک ہے۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ گو متموّل لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کی امداد کریں۔ مگر غریبوں کو بہرحال سوال سے پرہیز کرتے ہوئے اپنے آپ کو باوقار رکھنا چاہئے۔ اور پھر غرباء میں عزتِ نفس کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے فرماتے ہیں کہ ''اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) نیچے کے ہاتھ (یعنی لینے والے ہاتھ) سے بہتر ہوتا ہے''۔ ان مختصر الفاظ میں آپؐ نے خودداری اور عزّت نفس کی وہ روح بھر دی ہے جس کی کامل تفصیل شاید ضخیم کتابوں میں بھی نہ سما سکتی۔

صحابہ کی مقدس جماعت نے جب آپؐ کے اس ارشاد کو سُنا تو اُسے اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی۔ چنانچہ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپؐ کے اس ارشاد کے بعد میں نے کبھی کسی سے کوئی امداد نہیں لی مجھے خلفاء کی طرف سے مقررہ امداد کی رقم آتی تھی۔ مگر میں یہ کہتے ہوئے ہمیشہ انکار کر دیتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ہاتھ کو اونچا رکھنے کا حکم دیا ہے میں اسے نیچا نہیں ہونے دوں گا۔ حضرت علی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی بھی تھے اور داماد بھی تھے۔ اور پھر آپ کے بعد اسلام کے چوتھے خلیفہ بھی ہوئے۔ اور قریش کے ایک نہایت معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا ہجرت کے بعد یہ حال تھا کہ کلہاڑا

لے کر جنگل میں جاتے اور لکڑی کاٹ کر مدینہ میں لاتے اور اسے بازار میں بیچ کر اپنا گزارہ چلاتے تھے۔مگر کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ابو ہریرہؓ مشہور صحابی ہیں۔انہیں بعض اوقات کئی کئی دن کا فاقہ ہو جاتا تھا۔مگر کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ایک دفعہ بھوک نے نڈھال کر دیا۔تو صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے اتنا پوچھا کہ فلاں قرآنی آیت کے کیا معنی ہیں؟

اس آیت میں بھوکوں کو کھانا کھلانے کی تاکید تھی مگر اس وقت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان کا یہ اشارہ نہیں سمجھا۔اور معمولی تشریح بیان کر کے آگے روانہ ہو گئے۔اتفاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ گفتگو سن رہے تھے آپؐ نے ابو ہریرہؓ کو آواز دی کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں بھوک لگی ہے آؤ ادھر آؤ اور پھر آپؐ نے انہیں کچھ دودھ پینے کو دیا۔اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک دفعہ ایک سفر پر جاتے ہوئے ایک گھوڑ سوار معزز صحابی کا کوڑا ان کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔اس وقت ان کے آس پاس بعض پیدل لوگ بھی سفر کر رہے تھے مگر انہوں نے خود سواری سے نیچے اُتر کر اپنا کوڑا اُٹھایا۔اور کسی سے امداد کے طالب نہیں ہوئے۔اور جب ان کے ایک ساتھی نے ان سے کہا کہ آپ نے ہمیں کیوں نہ کہہ دیا کہ ہم آپ کا کوڑا اُٹھا کر آپ کو دے دیتے۔تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رسولِ خدا نے سوال سے منع کیا ہے اور میں اگر آپ سے کوڑا اُٹھانے کو کہتا تو یہ بھی گویا سوال ہی کا رنگ ہو جاتا۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے تعفف اور قناعت اور خودداری کا وہ نمونہ دکھایا کہ تاریخ اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف اغنیاء کو ہدایت دی کہ اگر کوئی سوال

کرے تو اسے رد نہ کرو۔ اور دوسری طرف غرباء کو یہ تاکید فرمائی کہ عزت کی روٹی کھاؤ اور سوال سے پرہیز کرو۔ بظاہر یہ دونوں متضاد باتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کا مرکب نظریہ ہی امیر و غریب کے باوقار برادرانہ تعلق کی صحیح بنیاد بن سکتا ہے۔

﴿37﴾

اپنے وارثوں کو اپنے پیچھے اچھی حالت میں چھوڑو

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ جَاءَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعُوْدُنِیْ وَ اَنَا بِمَکَّۃَ فَقَالَ اِنَّکَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ اَغْنِیَاءَ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَذَرَھُمْ عَالَۃً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ (بخاری)

ترجمہ: سعد بن ابی وقاص ؓ بیان کرتے ہیں کہ جب میں مکّہ میں بیمار ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کیلئے تشریف لائے تو مجھ سے فرمایا کہ اگر تم اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں ایسی حالت میں چھوڑو کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

تشریح: یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمائے تھے جب کہ آپ کے مقرب صحابی سعد بن ابی وقاص ؓ مکّہ کے سفر کے دوران بیمار پڑ گئے۔ اور انہوں نے یہ خیال کرکے کہ شاید میری وفات قریب ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے پیچھے اپنا سارا مال خدا کے رستے میں وقف کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں یہ زیادہ ہے میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس پر انہوں نے دو تہائی مال وقف کرنا چاہا۔ مگر آپؐ نے اس کی بھی اجازت نہیں دی۔ آخر حضرت سعدؓ نے ایک تہائی کی اجازت مانگی۔ آپؐ نے اس کی اجازت دی مگر ساتھ ہی فرمایا کہ اگر تم اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ تو یہ اس سے بہتر

ہے کہ تم انہیں ایسی حالت میں چھوڑو کہ وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔ اس حکیمانہ ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام پیش آمدہ حالات کے ماتحت ظاہری اسباب کو بھی مدّنظر رکھتا اور دور اندیشی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ ایک ایسا مسلمان جو مال رکھتا ہے وہ اپنے وارثوں کو محروم کرکے سارا مال خدا کے رستہ میں دے جائے اور اس کے پیچھے اس کے وارث بھیک مانگتے پھریں۔

مگر افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمانوں نے توکّل کا غلط مطلب سمجھ رکھا ہے۔ اور یہ خیال کر رکھا ہے کہ جس بات کو خدا پر چھوڑا جائے اس میں ظاہری تدابیر کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لینی چاہئیں۔ حالانکہ اسلامی توکّل کا ہرگز یہ مطلب نہیں بلکہ صحیح اسلامی توکّل یہ ہے کہ اپنے حالات اور اپنی طاقت کے مطابق ساری ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اور اس کے ساتھ خدا پر توکّل بھی کیا جائے۔ اور یقین رکھا جائے کہ ان ظاہری تدبیروں کے باوجود فتح وظفر کی اصل کنجی صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک بہت مشکل بلکہ بظاہر متضاد مقام نظر آتا ہے۔ جس پر عمل کرنا تو درکنار اس کا سمجھنا بھی آسان نہیں۔ مگر حق یہی ہے کہ صحیح اسلامی توکّل یہ ہے کہ ایک طرف تمام ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اور دوسری طرف ان تدبیروں کی تاروں کے متعلق یقین رکھا جائے کہ وہ خدا کے ہاتھ میں ہیں اور یہ کہ بہر حال ہوگا وہی جو خدا کی مشیّت ہے اور اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں چیزیں متضاد نہیں ہیں۔ کیونکہ جب ہر تقدیر خیر و شر اور تمام خواص الاشیاء اور ہر قسم کے اسباب اور مسببات کا خالق و مالک خدا ہی ہے تو اس میں کیا شک ہے کہ ظاہری تدبیروں کے باوجود

ہمارے اعمال کے نتائج کی آخری تاریں خدا کے ہاتھ میں سمجھی جائیں گی ۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ ایک بدوی رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ملاقات کے شوق میں اپنی اونٹنی مسجد نبوی کے دروازہ کے باہر کھلی چھوڑ آیا۔ جب وہ آپؐ سے ملکر واپس گیا تو اس کی اونٹنی بھاگ کر غائب ہو چکی تھی ۔ وہ گھبرایا ہوا مسجد میں واپس آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے خدا کے توکّل پر اپنی اونٹنی کو چھوڑا تھا۔ مگر جب آپؐ سے مل کر باہر گیا ہوں تو وہ بھاگ چکی تھی ۔ آپ نے فرمایا **اعقلھا و توکّل** ”یعنی ایک طرف اپنی اونٹنی کا گھٹنا باندھو اور دوسری طرف خدا پر توکّل کرو“ اور یہی وہ لطیف الفاظ ہیں جن پر مولانا رومی علیہ رحمت نے یہ مشہور مصرعہ نظم کیا ہے کہ:

برتوکّل زانوئے اشتر بہ بند

خلاصہ یہ کہ حدیث زیر نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف اولاد کے باوقار گزارے کیلئے والدین کو دور بینی اور دُور اندیشی کی تعلیم دی ہے کہ جہاں تک تمہارے اختیار میں ہے اپنے متعلقین کو بے سہارا نہ چھوڑو اور ان کے لئے باوقار زندگی کا انتظام کرو۔ اور دوسری طرف آپؐ نے ضمناً اس حدیث میں یہ اشارہ بھی فرمایا ہے کہ ظاہری تدبیریں توکّل کے خلاف نہیں ۔ پس اپنی طاقت اور ذرائع کے مطابق ظاہری تدبیریں اختیار کرو۔ اور پھر خدا پر توکّل کرو۔ بیشک جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ یہ ایک نہایت مشکل مقام ہے کیونکہ انسان اپنی کمزوری میں ایک طرف جھک جانے کا عادی ہوتا ہے وہ یا تو صرف ظاہری تدبیروں پر جھک کر انہی کو اپنا خدا فرض کر لیتا ہے اور یا ظاہری تدبیروں کو کلیتہً چھوڑ کر خدا سے یہ امید لگا بیٹھتا

ہے کہ میں خدا کے بنائے ہوئے اسباب کو ٹھکراتا ہی رہوں۔ وہ بہرحال اپنے عرش سے اتر کر خود میرے کاموں کو سرانجام دے گا۔ مگر حق یہی ہے کہ یہ دونوں نظریئے باطل اور خلافِ تعلیمِ اسلام ہیں۔ اور سچا فلسفہ یہی ہے جس پر نیک لوگوں کا ہر زمانہ میں عمل رہا ہے کہ ”ایک طرف اپنی اونٹنی کا گھٹنا باندھو۔ اور دوسری طرف خدا پر توکّل کرو“۔

﴿38﴾

ہر شخص اپنی جگہ حاکم ہے اور اپنی حکومت کے دائرہ میں جواب دہ ہوگا

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ۔ (بخاری)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنے دائرہ کے اندر ایک حاکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق پوچھا جائے گا''۔

تشریح: ہر انسان کے ساتھ کچھ حقوق لگے ہوئے ہیں۔ اور کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اور یہ لطیف حدیث انہی دو باتوں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہر انسان کسی نہ کسی جہت سے حاکم ہوتا ہے خواہ وہ دوسری حیثیت سے کتنا ہی محکوم ہو۔ ایک شخص جو کسی صیغہ میں ملازم ہے وہ اپنے صیغہ میں اپنے افسر کے ماتحت ہوگا۔ لیکن گھر میں وہ اپنے بیوی بچوں کا حاکم بھی ہوگا۔ ایک عورت اپنے خاوند کے ساتھ محبت کے اعلیٰ مقام پر ہونے کے باوجود انتظامی رنگ میں محکوم ہوتی ہے۔ مگر گھر کے بچوں اور نوکروں پر اور نیز خاوند کے اس مال پر جو عورت کے سپرد

ہوتا ہے وہ حاکم بھی ہوتی ہے۔اسی طرح ایک بادشاہ سے لیکر غلام تک اور ایک جرنیل سے لیکر سپاہی تک اور ایک گورنر سے لیکر دفتر کے چپڑاسی تک سب اپنے اپنے دائرہ کے اندر حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔ بادشاہ ساری رعایا کا حاکم ہوتا ہے ۔مگر وہ خدا کا یا دوسرے لفظوں میں قضاوقدر کے قانون کا محکوم بھی ہوتا ہے۔اور یہی حال تمام دوسرے افسروں اور ماتحتوں کا ہے کہ وہ ایک جہت سے حاکم ہیں اور دوسری جہت سے محکوم ہیں ۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ سب لوگ اپنے اپنے دائرہ میں اپنی اپنی رعایا کے متعلق پوچھے جائیں گے کہ انہوں نے اپنے ماتحتوں کا حق ادا کیا یا نہیں؟ حتّٰی کہ جب ہم اس آخری انسان پر پہنچ جاتے ہیں جس کے نیچے بظاہر کوئی محکوم نظر نہیں آتا۔تو غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ دراصل وہ بھی ایک چیز کا حاکم ہے اور یہ چیز اس کا نفس ہے۔جس پر اُسے کامل اختیار دیا گیا ہے۔پس اس سے اس کے نفس کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ اس نے کہاں تک اس کا حق ادا کیا ہے۔اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص کو ہوشیار کیا ہے کہ خواہ وہ سوسائٹی کے کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی حیثیت میں حاکم ہے اور اسے اپنے دائرہ حکومت میں اپنے کاموں کی جواب دہی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

دوسری طرف یہ حدیث لوگوں کے لئے ایک بشارت بھی ہے اور ان کی ہمتوں کو بلند کرتی ہے کہ خواہ اس وقت تم درجہ میں کتنے ہی نیچے ہو۔تم بہرحال دوسری جہت سے حاکم بھی ہو۔پس تمہیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے تمہیں اپنی ازلی حکومت کا ایک منصب عطا کر رکھا ہے۔اور اگر تم اس کے شکر گزار ہو گے تو کل کو تم

ترقی کر کے اپنی موجودہ حکومت سے بہتر حکومت کے وارث بن سکتے ہو۔ الغرض حقوق اور ذمہ داریوں کا یہ لطیف مرکب انسان کے لئے ایک بشارت بھی ہے اور انذار بھی۔ بشارت اس لئے کہ ہر حکومت خدا کا ایک انعام ہے۔ اور انذار اس لئے کہ ہر حکومت کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ پس سچا مومن وہ ہے۔ جو بشارت کے پہلو پر شکر گزار ہوتا اور ذمہ داری کے پہلو کی طرف سے ہمیشہ چوکس وہوشیار رہتا ہے۔ کہ اسی میں اس کی ترقی کا ازلی راز ہے۔

﴿ 39 ﴾

علم سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ(ابن ماجۃ)

ترجمہ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔

تشریح: چونکہ اسلام کی بنیاد اس یقینی علم پر ہے جو خدا کی طرف سے آخری شریعت کی صورت میں نازل ہوا ہے اور پھر اسلام ہر بات کو دلیل کے ذریعہ منواتا ہے۔ اس لئے اسلام میں علم کے حصول کے لئے انتہائی تاکید کی گئی ہے۔ اور یہ حدیث ان بہت سی حدیثوں میں سے ایک ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں اور عورتوں کو علم سیکھنے کی تاکید فرمائی ہے اور اس ہدایت پر آپؐ کو اتنا اصرار تھا کہ ایک دوسری حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں کہ ''علم سیکھو خواہ اس کے لئے تمہیں چین کے کناروں تک جانا پڑے''۔ اور یاد رہے کہ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے چین کا ملک نہ صرف عرب سے ایک دور ترین ملک تھا۔ بلکہ اس کے رستے بھی ایسے مخدوش تھے کہ وہاں تک پہنچنا غیر معمولی اخراجات اور غیر معمولی کوفت اور غیر معمولی خطرے کا موجب تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چین کے ملک کو مثال

کے طور پر بیان فرما کر دراصل اشارہ یہ کیا ہے کہ خواہ تمہیں علم حاصل کرنے کے لئے کتنی ہی دور جانا پڑے اور کیسی ہی تکلیف کا سامنا ہو۔ علم وہ چیز ہے کہ اس کے لئے مومن کو ہر تکلیف اُٹھا کر اس کے حصول کا دروازہ کھولنا چاہئے ۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ بعض اوقات ابتدائی مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حدیث سننے کے لئے سینکڑوں میل دور کا سفر اور غیر معمولی اخراجات برداشت کر کے صحابہ کی تلاش میں پہنچتے تھے ۔ چنانچہ جب ایک شخص مدینہ سے سینکڑوں میل کا سفر اختیار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو درداء کے پاس ایک حدیث سننے کی غرض سے دمشق آیا تو ابو درداء نے اسے وہ حدیث بھی سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص علم حاصل کرنے کی غرض سے کسی رستہ کا سفر اختیار کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے لئے اس علم کے علاوہ جنّت کا رستہ بھی کھول دیتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک عالم انسان کا درجہ ایک ایسے عابد انسان کے مقابلہ پر جو اپنی عبادت کے باوجود علم سے خالی ہے ایسا ہے کہ جیسے عام ستاروں کے مقابلہ پر چودھویں رات کا چاند ہوتا ہے اور ایک تیسری حدیث میں فرماتے ہیں ۔ کہ ایک عالم انسان شیطان پر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ اور ایک چوتھی حدیث میں فرماتے ہیں کہ میری اُمّت کی بہترین بھلائی نیک علماء میں ہے اور ایک پانچویں حدیث میں فرماتے ہیں کہ علماء گویا نبیوں کے وارث ہوتے ہیں۔ مگر جیسا کہ چوتھی حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے سچا علم وہی ہے جس کے ساتھ نیکی اور تقویٰ شامل ہو۔

الغرض اسلام میں علم کے حصول کی انتہائی تاکید کی گئی ہے اور سچّے علم کا وہ

مقام تسلیم کیا گیا ہے جو ایمان کے بعد کسی دوسری چیز کو حاصل نہیں۔اور پھر علم کو ایک غیر محدود چیز قرار دے کر ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ تمہیں کتنا ہی علم حاصل ہو جائے پھر بھی مزید علم کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔ چنانچہ اور تو اور خود فخرِ موجودات سرورِ کائنات سید الرسل حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ قرآن شریف میں یہ دُعا سکھاتا ہے کہ قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ’’یعنی اے رسول تم ہمیشہ یہ دُعا مانگتے رہو کہ خدایا! میرے علم میں بیش از بیش ترقی عطا کر‘‘ اور پھر جیسا کہ حدیث زیر نظر میں صراحت کی گئی ہے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے حصول کو صرف مَردوں تک محدود نہیں کیا بلکہ عورتوں کو بھی اسی طرح تاکید فرمائی ہے۔مگر افسوس ہے کہ ان تاکیدوں کے باوجود آج کل مسلمان مردوں اور عورتوں کا علمی معیار دوسری قوموں کے مقابلہ پر اعلیٰ ہونا تو در کنار کافی ادنیٰ اور پست ہے۔ چنانچہ تقسیم ملکی سے پہلے ہندوستان کی ساری قوموں یعنی ہندوؤں سکھوں ،غیر ملکی عیسائیوں اور پارسیوں وغیرہ کے مقابلہ پر مسلمانوں کی خواندگی کی شرح فی صدی سب سے کم تھی۔ دنیا کے عالم ترین مصلح کی امّت کا یہ نمونہ یقیناً بے حد قابلِ افسوس ہے اور وقت ہے کہ مسلمان اپنے فرض کو پہچان کر دین و دنیا کے علم میں نہ صرف اوّل نمبر حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ اس مقام کو پہنچیں جس کی گرد کو بھی کوئی دوسری قوم نہ پا سکے۔

﴿ 40 ﴾

ہر حکمت کی بات مومن کی اپنی ہی کھوئی ہوئی چیز ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ مَا وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا (ترمذی)

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ حکمت اور دانائی کی بات تو مومن کی اپنی ہی کھوئی ہوئی چیز ہوتی ہے اسے چاہئے کہ جہاں بھی اسے پائے لے لے۔ کیونکہ وہی اس کا بہتر حقدار ہے۔

تشریح: یہ لطیف حدیث جو میرے اس انتخاب کی آخری حدیث ہے علم کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ بتاتی ہے علم ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ صرف درس گاہوں میں شامل ہو کر یا مسجد کے خطبات سن کر یا عالموں کی مجلس میں بیٹھ کر یا اخبار پڑھ کر یا کتابوں کا مطالعہ کر کے ہی حاصل ہو سکے۔ بلکہ وہ ایک بہت وسیع چیز ہے جسے آنکھیں اور کان کھول کر زندگی گزارنے والا انسان صحیفۂ عالم کی ہر تختی سے حاصل کر سکتا ہے۔ علم کا شوق رکھنے والے انسان کے لئے زمین و آسمان اور سورج و چاند اور ستارے و سیارے اور جنگل و پہاڑ اور دریا و سمندر اور شہر و ویرانے اور دیوانے و فرزانے اور انسان و حیوان اور مرد و عورت اور بچّے و بوڑھے اور جاہل و عالم اور دوست و دشمن سب ایک کھلی ہوئی علمی کتاب ہیں جن سے وہ اپنی استعداد اور اپنی

کوشش کے مطابق علم کے خزانے بھر سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے آقا (فداہ نفسی) صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ علم وحکمت کی بات مومن کی اپنی ہی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ اسے چاہیئے کہ جہاں بھی اسے پائے لے لے۔ اور اپنے دل و دماغ کی کھڑکیوں کو اس طرح کھول کر رکھے کہ کوئی علمی بات جو اس کے سامنے آتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کے خزانہ میں داخل ہونے سے باہر نہ رہے۔ یہ وہ علم کی وسعت ہے جس کی طرف یہ حدیث اشارہ کر رہی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر انسان کے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھلی ہوں تو بسا اوقات ایک عالم انسان ایک بچہ سے بھی علم حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بچے کو بارش اور کیچڑ میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اور اسے آواز دی کہ میاں بچے ذرا سنبھل کر چلو تا ایسا نہ ہو کہ گر جاؤ۔ بچے نے گھوم کر جواب دیا۔ امام صاحب آپ اپنی فکر کریں۔ کیونکہ میں تو ایک معمولی بچہ ہوں۔ اگر میں گرا تو میرے گرنے کا اثر صرف میری ذات تک محدود رہے گا۔ لیکن آپ دین کے امام ہیں اگر آپ پھسلے تو قوم کی خیر نہیں۔ امام صاحب کی طبیعت بڑی نکتہ شناس تھی فوراً فرمایا کہ اس بچہ نے تو آج مجھے بڑا قیمتی سبق دیا ہے۔

اس حدیث کے تعلق میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جو اس حدیث میں ضالۃ (کھوئی ہوئی چیز) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ ایک مسلمان کو جو بھی حکمت اور دانائی کی بات نظر آتی ہے۔ وہ خواہ اسے پہلے سے معلوم ہو یا نہ ہو۔ درحقیقت اس کا بیج اسلام میں موجود ہوتا ہے اور اسی لئے اسے ضالۃ کہا گیا ہے تا کہ اس بات کی طرف اشارہ کیا جائے کہ یہ چیز حقیقۃً مومن کی

اپنی تھی ۔مگر اس کی نظر سے اوجھل رہ کر اس کے قبضہ سے باہر رہی اس صورت میں مومن کا یہ حق ہے کہ اسے جب بھی ایسی چیز ملے ۔وہ اسے فوراً لے لے ۔اس لئے نہیں کہ اسے کسی دوسرے کی چیز کے اڑا لینے کا موقعہ میسّر آ گیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اسے اپنی ہی کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی ہے ۔اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضالۃ کے بعد یہ الفاظ فرمائے ہیں کہ **فھو احق بھا** ’یعنی مومن ہی اس چیز کا زیادہ حقدار ہے‘‘ ۔خواہ وہ بظاہر دوسرے کے قبضہ میں ہو۔اور اگر غور کیا جائے تو حقیقۃً ہر علم وحکمت کی چیز کا اصل الاصول اسلام میں موجود ہے۔ جیسا کہ خود قرآن شریف فرماتا ہے کہ **فیھا کتب قیمۃ** ’’یعنی ہر دائمی صداقت جو انسان کے کام کی ہے وہ قرآن میں موجود ہے‘‘ ۔مگر افسوس ہے کہ بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں ۔ جو غور کرتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

حق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو کچھ حدیث میں فرمایا ہے وہ بھی دراصل قرآن ہی کی تفسیر ہے ۔لیکن ظاہر ہے کہ آپؐ کی نظر جہاں پہنچی ہے وہاں کسی اور کی نہیں پہنچی اور نہ پہنچ سکتی ہے ۔آپؐ نے خدائی تائید ونصرت سے قرآن کے مستور اشاروں کو حدیث کے منشور اوراق پر سجا کر رکھ دیا ہے لیکن اس مادی عالم کی طرح جو حضرت آدم سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرتا آیا ہے ۔قرآن بھی درحقیقت ایک روحانی عالم ہے جس کے خزانے کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور اسی لئے اس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنْ مِنْ شَیءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ۔ ’’یعنی ہمارے پاس (قرآن میں) ہر قسم کے روحانی اور علمی خزانے موجود ہیں مگر ہم انہیں ایک فیصلہ شدہ اندازے کے

مطابق صرف حسبِ ضرورت ظاہر کرتے ہیں‘‘۔پس اس میں کیا شک ہے کہ دراصل ہرعلم وحکمت کی چیز مومن کی ضالۃ ہے کیونکہ اس کا بیج قرآن مجید میں موجود ہے اور قرآن مومن کا اپنا خزانہ ہے۔خواہ کوئی شخص اس کے اندر کے ذخیروں پر آگاہ ہو یا نہ ہو۔کاش دنیا قرآن کے مقام کو سمجھے اور کاش دنیا حدیث کے ان جواہر پاروں کی قدر بھی پہچانے جو ہمارے آقا نے قرآن کی کان سے نکال کر ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین

خاتمہ اور دُعا

دنیا سے میرا یہ خطاب ختم ہوا۔لیکن انسان صرف ایک جسم تیار کرسکتا ہے اس جسم کے اندر روح ڈالنا خدا کا کام ہے پس دنیا کے خطاب کے بعد میں اپنے آسمانی آقا سے جو ساری خوبیوں کا جامع اور ساری طاقتوں کا مالک ہے عرض کرتا ہوں کہ اے میرے آقا! میں نے اپنی طرف سے خلوصِ دل اور پاک نیّت کے ساتھ تیرے مقدس رسول (فداہ نفسی) کی یہ چالیس حدیثیں مختلف کتابوں سے جمع کر کے مرتب کی ہیں مگر تیری نصرت اور تیری رحمت کے بغیر میرا یہ کام اس برکت کو حاصل نہیں کرسکتا جو تیری طرف سے آسمان کی بلندیوں سے نازل ہوتی اور مردہ جسموں میں جان ڈالتی اور خاک کے ذروں کو چمکتے ہوئے ستارے بنا دیتی ہے۔پس اے میرے آقا! تو اب اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ میری یہ مختصر سی تصنیف تیری ازلی اور ابدی برکتوں سے حصہ پائے اور تیرے مقدس رسول کا یہ کلامِ پاک اس رسالہ کے پڑھنے والوں کے دلوں میں نور اور دماغوں میں روشنی اور جوارح میں برکت پیدا کرنے کا موجب ہو۔اس کے ذریعہ افراد اور خاندان اپنی اصلاح کا رستہ پائیں اور قومیں اور ملتیں عروج اور ترقی کی طرف قدم بڑھانے میں مدد حاصل کریں کیونکہ گو بظاہر یہ الفاظ سادہ ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو ان کے اندر اصلاح اور ترقی کے بے شمار رستے مخفی ہیں اور اے میرے خالق و مالک خدا تو مجھے بھی اپنے فضل و رحمت کے سایہ میں جگہ دے اور اپنے حبیب پاک کی اس محبت کے طفیل جو تو نے میرے ناچیز دل میں ودیعت کی ہے مجھے اس دنیا میں اس کی لائی ہوئی تعلیم پر قائم رکھ اور آخرت میں اس کے قدموں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ **آمین یا ارحم الراحمین**